دسمبر
۲۰۱۱ء

اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان**

جلد ۱۵، شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۱ء/محرم ۱۴۳۳ھ

مشمولات

جمہوریت کا پریشر ککر	مدیر	۲
O دینی مدارس		
دینی مدارس: نصاب میں تبدیلی کی ضرورت	مولانا حسین احمد مدنی	۳
O جدید تعلیم		
انقلاب امامت کے لیے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۶
انگریزی کی حکومت	مدیر	۷
O دینی سیاست		
دینی سیاسی جماعتوں میں اتحاد کا فارمولا	ڈاکٹر محمد امین	۱۶
کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب آسکتا ہے؟	مدیر	۱۸
O اسلام اور مغرب		
ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق (۲)	سید خالد جامعی	۲۱
O تزکیۂ نفس		
نماز اچھی کیسے ہوسکتی ہے؟	احمد جاوید	۲۸
O ہماری سرگرمیاں		
تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ۔ ایک تعارف	ادارہ	۳۲
O مدیر کے نام		
بلال اسلامک سنٹر کی خدمات	محمد ممتاز قطب	۴۳
مجوزہ قرآن یونیورسٹی کے خدوخال	انجینئر مختار فاروقی	۴۴

البرہان آن لائن دستیاب ہے

http://www.safa.edu.pk/category/al-burhan/

جمہوریت کا پریشر ککر

احباب کی ایک مجلس میں ہم نے کہا:
ہماری سیاسی قیادت کا کام کیا ہے؟ امریکی غلامی پہ قانع رہنا اور اس کی تہذیب اور مطالبات کو سپورٹ اور پروموٹ کرنا — گویا نظریاتی سرحدوں کی عدم حفاظت

اور

فوجی قیادت کا کام کیا ہے؟ امریکی حملوں کی مزاحمت نہ کرنا اور انہیں سپورٹ کرنا — گویا زمینی سرحدوں کی عدم حفاظت

تو — ان حالات میں — ہماری بقاء کا جواز کیا ہے؟

ایک صاحب بولے: نہیں! وہ ایک کام اور بھی کرتے ہیں — کہ آپ جیسوں کی تنقید برداشت کرتے ہیں
ہم نے کہا: واقعی! یہ تو بڑی بات ہے۔

اس پر ایک تیسرے صاحب بولے: بھئی! یہ تو ایک نفسیاتی ٹیکنیک ہے کہ جو بولتا ہے اسے بولنے دو کہ اِس طرح جذبات کی نکاسی ہوتی رہتی ہے اور عملاً کوئی تبدیلی بھی نہیں آتی۔ اگر یہ بھی نہ ہو اور جذبات جمع ہوتے رہیں تو معاشرہ ایک دن پریشر ککر کی طرح پھٹ پڑے اور تبدیلی آجائے جیسے مسلم عرب اور افریقی ممالک میں آرہی ہے۔ تو یہ نسخہ، جسے سیاسی لغت میں 'جمہوریت' کہتے ہیں، دراصل حقیقی تبدیلی روکنے کا ایک مؤثر نسخہ ہے۔

لہٰذا موجودہ حالات میں پاکستان میں اسلامی تبدیلی یا کسی بھی حقیقی تبدیلی کے آنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی

دینی مدارس: نصاب میں تبدیلی کی ضرورت

یہ اس نصاب کا مقدمہ ہے جو مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ہندوستان کے دینی مدارس، خصوصاً مدارس بنگال و سہلٹ، کے لیے تیار کیا تھا۔ اس پر کوئی تاریخ موجود نہیں تاہم اندازہ ہے کہ یہ مولانا کے دیوبند میں تدریس سے پہلے کا تیار کردہ ہے۔ ہم اس نصاب کے اہم اجزاء البرہان میں شائع کریں گے، ان شاء اللہ۔ مضمون کا عنوان ہمارا ہے۔ امین

الحمدللہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین والہ وصحبہ وتابعیہ اجمعین

موسم کی تبدیلی اگر پوشاک اور خوراک کے ردوبدل کی خواہاں ہے اور ممالک و اقطار علم کی مزاجی کیفیتوں کا اختلاف سکان کے احوال و عادت پر اثر رساں ہے۔ اور اگر مفید خزائن علمیہ کا تجدد الانفع فالانفع کو اختیار کرنے کا قانون بناتا ہے اور مختصرات و جوامع شروح جدید اور حواشی مفیدہ کا روز افزوں ذخیرہ متقدمین کی مسلمہ کتابوں کی جگہ لینے کی سنت زمانہ سلف سے دکھاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمانۂ موجودہ اور دیار ہندیہ میں ہم زمان اور مکان کی مختلف حادثہ اور قدیمہ ضرورتوں سے چشم پوشی کریں اور ان مفید اور انفع کتابوں کو فنون ضروریہ رائجہ میں قابل فروگزاشت سمجھیں جو کہ قدیم نصاب کی کتابوں سے نفع رسانی میں نہایت اعلیٰ شان رکھتی ہیں۔

ہم کسی طرح اس امر کو قابل عمل نہیں قرار دے سکتے کہ پرانی کتابیں صرف اس وجہ سے ہی ضروری ہیں کہ اسلاف کی تصنیف کردہ یا اسلاف کے زیر تدریس رہا کی ہیں۔ اور جدید تصنیف کردہ کتب صرف اس وجہ سے قابل ترک قرار دی جائیں کہ وہ زمانہ حال یا قریب کی تصنیف کی ہوئی ہیں یا اسلاف نے ان سے نفع نہیں اٹھایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور اور غیر مشہور کتابوں پر صدر شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف نے جالے کھینچ دیے۔ صاحب ہدایہ اور صدر الشریعہ وغیرہ کی تصانیف نے اپنے سے پہلوں کی تصانیف کو زوایا خمول میں نسیاً منسیاً کر دیا۔ کتاب سیبویہ اور مبرد وغیرہ کی تصانیف پر ابن حاجب اور مالک کی تصانیف قضاء بالموت کا حکم نافذ کرتی رہیں اور فارابی اور ابن سینا کی تالیفات پر تصانیف میر زاہد و محب اللہ بہاری وغیرہ پردہ ڈالتی ہیں۔

اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقات تحریر یہ قرار دیتے ہیں کہ زید بن ثابتؓ کو زبان عبرانی سیکھنے کا حکم فرمائیں اور اگر ملوک عجم کا کسی خط کو بلا مہر قابل اعتبار نہ سمجھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آمادہ کرتا ہے کہ انگشتری اور مہر تیار کرائیں تو ہم کو زمانۂ موجودہ پر نظر ڈالتے ہوئے اجنبی زبانوں اور فنون وغیرہ کے سیکھنے اور سکھانے کو یک قلم پس انداز کر دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ مذہبی حیثیت بھی مثل معاشی ضرورتوں کے تقاضا کرتی ہے کہ اقوام عالم کی زبان ان کے رسم و رواج اور ان کے علوم و فنون وغیرہ سے واقفیت حاصل کی جائے۔

مذکورہ بالا امور اور اس قسم کے مختلف اور متعدد وقائع عرصہ دراز سے مجھ کو پریشان کر رہے تھے کہ موجودہ اور رائجہ نصاب زمانۂ حال میں قابلِ اصلاح و ترمیم ضرور ہے مگر زمانہ نے مجھ کو اب تک مہلت نہ دی۔

میں نے ایام تعلم و استفادہ میں دیوبند کا نصاب تعلیم (جس کا بڑا حصہ درس نظامی کا خوشہ چین ہے) اپنے لیے معراج ترقی اور مسلم زندگی قرار دیا۔ اور حسب استعداد و قابلیت بڑے درجہ تک اس سے فیض یاب ہوا مگر مدینہ منورہ میں مجھ کو جامعہ ازہر (مصر) اور استنبول بخارا وغیرہ کے نصابوں سے سابقہ پڑا۔ پھر زندگانی کے مختلف شعبوں پر غور و خوض کرنے کی نوبت بھی آئی۔ مختلف ممالک اور متعدد حکومتوں کے احوال نظر سے گزرے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصابوں پر بھی بڑے درجہ تک عبور پہلے سے حاصل تھا۔ زمانۂ حال کی مختلف اسلامی یونیورسٹیوں (جامعہ عثمانیہ دکن، جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی، ندوۃ العلماء وغیرہ) کو بھی زیر نظر لانے کی نوبت آئی حتی الوسع احباب و اکابر، اصحاب الرائے اور ارباب تجربہ سے مشوروں کی نوبت بھی بارہا آئی۔ بالآخر یہ موجودہ نصاب انتخاب اور غور و تدبر کے بعد قوم کے سامنے پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیمی حالت پر پوری روشنی ڈالنا اور مکمل اصلاح و ترمیم مجھ جیسے ناواقف اور کم مایہ طالب علم کا کام نہیں مگر جبکہ اکابر قوم کو اس طرف کما حقہ توجہ نہیں تو پھر کم مایہ اشخاص ہی کو قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ ملک میں مختلف جماعتیں موجود ہیں جنہوں نے بعض امور کو اپنا مطمع نظر بنا کر دوسرے ضروری مقاصد کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے مگر اس نصاب میں اپنی فہم و تجربہ کی بناء پر وہ صحیح راستہ اختیار کیا گیا ہے جو کہ مسلمانوں کو اصلی اور حقیقی کامیابی کے بام ترقی پر پہنچانے والا ہے۔ اگرچہ نصاب سے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ طلباء کو حافظ فنون و علوم بنایا جائے بلکہ ایک ایسی استعداد اور

قابلیت پیدا کرنی مقصود ہوتی ہے جس سے وہ جملہ ضروری فنون میں پوری قوت پیدا کرلیں تا کہ ضرورت یا تکمیل کے وقت ان کو کوئی نقصان سدراہ نہ ہوسکے مگر تاہم ان کو بہت سے فنون اور بہت سی اہم تر کتابوں اور اعمال سے دوچار ہونا ضروری ہے تا کہ یہ ملکہ راسخہ حاصل ہو۔

میں ابھی تک محسوس کررہا ہوں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دائرۂ تصنیف و تالیف غیر مکمل ہے اور موجودہ کتابیں ہماری ضرورتوں کے لیے ایک درجہ تک ہماری زبان میں ناکافی ہیں مگر تاہم ان شاء اللہ یہ نصاب اگر اکابر قوم نے پسند فرمایا اور رائج کیا تو مجھ کو قوی امید ہے کہ ہمارے قوم و ملک میں اچھے اچھے اشخاص پیدا ہوسکیں۔

میں نے اگرچہ یہ نصاب تمام قطر ہند کے لیے تیار کیا ہے مگر چونکہ صوبہ بنگال کے اکابر و عمائد کی خدمات عالیہ میں اولاً پیش کرنے کا مجھ کو فخر حاصل ہوا ہے اس لیے میں نے بنگلہ زبان اور یہاں کے طرز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ دوسرے صوبہ میں اس کا تغیر حسب مکان نہایت آسانی سے ہوسکے گا۔

آخر میں اپنی بضاعت مزجاۃ میں اکابر قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے غلطیوں کی معافی اور اصلاح کی درخواست پیش کرتا ہوں اور اگر پسند خاطر ہوتو دعا اور ترویج کا خواستگار ہوں۔

والسلام

میں ہوں آپ کا خادم،

ننگ اکابر،

حسین احمد غفرلہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اُسے پھیر!
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر!

سید ابوالاعلیٰ مودودی

انقلابِ امامت کے لیے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے

ناخدا شناس آئمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا لہٰذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو، اس کے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضا یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

جو نظامِ تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے، اس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب برپا کرنے کے لیے آپ کو تیار کر سکے۔ لہٰذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اس نظامِ تعلیم پر جمے رہیں ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہوگا۔ جو نظامِ تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس آئمہ کی ترتیب اور ان کا زاویۂ نظر ہے اور جو اس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو آئمہ ضلال نے بنائی ہے وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہوسکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی یا اسلامیہ کالج یا اسلامیہ ہائی سکول کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے جوڑ دینا ۹۵ فی صدی تو بالکل ہی لاحاصل ہے اور ۵ فی صدی فائدہ اگر اس سے حاصل بھی ہوسکتا ہے تو وہ بیش ازیں نیست کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستے پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔ اصلاحِ تعلیم کا یہ لائحہ کہ علومِ اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگا یا جائے۔ یہ بھی امامت میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے آپ کو تیار نہیں کرسکتا۔ اس لیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدون و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصّبات اور اہواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کو بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔

(بقیہ دیکھیے صفحہ نمبر ۱۵ کے آخر میں)

جدید تعلیم　　ڈاکٹر محمد امین

انگریزی کی حکومت

گلی کوچوں میں کھلنے والے انگلش میڈیم سکولوں کا کاروبار اپنے عروج پر تھا کہ حکومت پنجاب نے سوچا کہ وہ اس ''کارِ خیر'' سے کیوں پیچھے رہے چنانچہ اس نے بھی اپنے زیرِ نگرانی سکولوں میں نئے تعلیمی سال سے پہلی جماعت سے انگریزی میڈیم کو لازمی کر دیا ہے۔ اب غریبوں کے بچے بھی ''بابا بلیک شیپ'' کورس میں گائیں گے اور ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا ؎

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

انگریزی کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ ہمارے سائنس دانوں، انجینئروں، صنعت کاروں، سیاست دانوں، سفارت کاروں اور اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبہ کو انگریزی ضرور جاننی چاہیے کیونکہ انہیں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ انگریزی سیکھنا اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اور علوم وفنون کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔

تاہم یہ ایک خالص فنی نوعیت کا سوال ہے کہ انگریزی سیکھنے کے خواہش مند یا ضرورت مند طلبہ کو انگریزی کب سکھائی جائے؟ انگریزی بولنے والے ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے آزاد ممالک میں انگریزی سکھانے کا یہ طریقہ مروج ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مرحلے پر کسی غیر ملکی زبان کی تدریس لازمی کر دی جاتی ہے یا وہاں غیر ملکی زبانوں کی تدریس کی اکیڈیمیاں قائم کر دی جاتی ہیں۔ ثانوی یا یونیورسٹی تعلیم کے بعد جو طالب علم اپنے شوق سے یا کسی ضرورت سے انگریزی سیکھنا چاہتا ہے وہ ان اکیڈیمیوں سے سال چھ مہینے میں بنیادی انگریزی سیکھ لیتا ہے۔ اگر کوئی اس زبان میں زیادہ مہارت حاصل کرنا چاہے تو اس کے مواقع بھی موجود ہوتے ہیں۔ جب ساری دنیا میں غیر ملکی زبانیں سکھانے کا یہی طریقہ مروج ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم کیوں ایک غیر ملکی زبان اپنے سارے بچوں کو اور وہ بھی پہلی جماعت سے پڑھانا چاہتے ہیں؟ اور یہی نہیں بلکہ اس غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر مصر ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر میں ہر تعلیمی ادارہ 'انگلش میڈیم' ہونے کا تمغۂ افتخار اپنے سینے پر سجائے ہوئے ہے؟

پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے مالکان کا کہنا یہ ہے کہ اردو میڈیم میں والدین اپنے بچے نہیں

بھجواتے لہٰذا انگریزی میڈیم سکول کھولنا ہماری مجبوری ہے کہ تعلیم دینا ہمارا ذریعہ روزگار اور کاروبار بھی ہے۔ حکومت کا مؤقف یہ ہے کہ جب سارے پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں انگریزی پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے تو سرکاری سکول کیوں اس کارِ خیر میں پیچھے رہیں تاکہ طبقاتی فرق نہ بڑھے اور ملک کے تمام طبقوں کو یکساں ترقی کے مواقع ملیں۔

سوال یہ ہے کہ آخر ترقی کا انحصار انگریزی پر کیوں ہے اور یہ کون سی ترقی ہے جو انگریزی کے بغیر نہیں ہوسکتی؟ ہمارے سامنے جاپان نے انگریزی کے بغیر ترقی کی ہے۔ جرمنی نے انگریزی کے بغیر ترقی کی ہے۔ روس سائنس کے بعض میدانوں میں امریکہ سے بھی آگے تھا وہاں انگریزی 'حرام' تھی۔ فرانس ایک ترقی یافتہ قوم ہے اور انگلینڈ سے چند کوس کے فاصلے پر واقعہ ہے۔ وہاں جائیں تو جن کو انگریزی آتی ہے وہ بھی انگریزی میں بات کرنا پسند نہیں کرتے! تو آخر یہ کون سی ترقی ہے جو ہم انگریزی کے بغیر نہیں کرسکتے؟

اس سوال کے جواب کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترقی اصلاً انگریزی پر منحصر نہیں ہے۔ یہ ہم ہیں جنہوں نے اسے انگریزی سے منسلک کررکھا ہے کیونکہ غلامی ابھی تک ہمارے ذہن وقلب سے نہیں نکلی۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کی حکومت ختم ہوگئی لیکن انگریزی کی حکومت ابھی تک قائم و دائم ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ استعمار (جغرافیائی طور پر چلا گیا کہ یہ اس کی مجبوری تھی لیکن وہ) آج بھی اپنی زبان کے ذریعے ہم پر حکمرانی کررہا ہے۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ اگر ترقی کا انحصار انگریزی پر ہے تو پھر پچاس سال سے بلکہ ڈیڑھ سو سال سے انگریزی پڑھ رہے ہیں ہم نے ترقی کیوں نہیں کی؟ جاپان اور جرمنی نے ہمارے دیکھتے دوسری جنگ عظیم میں تباہ ہونے کے بعد انگریزی کے بغیر ترقی کرلی ہے لیکن ہم ہیں کہ دیڑھ سو سال سے انگریزی پڑھ رہے ہیں لیکن ترقی ہمارے قابو میں نہیں آرہی؟

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے بھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ ہمیں سوچنے کی ضرورت ہے کہ انگریزی اختیار کرکے ہم نے ملی سطح پر کیا کھویا اور کیا پایا اور ہم بھی آج اپنے ماہرین تعلیم اور دانشوروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری ترقی آخر ایک غیر ملکی زبان کے ساتھ لازم وملزوم کیسے ہوگئی ہے؟ ہم جو ایک قوم ہیں، اپنا ایک مخصوص تمدن رکھتے ہیں، ہماری ترقی کا انحصار ایک غیر ملکی زبان پر کیسے ہوسکتا ہے جو ایک مختلف تہذیب، مختلف فکر اور مختلف تمدن کی پیداوار اور علمبردار ہے؟ کیا سائنس

اور ٹیکنالوجی میں ترقی محض ایک ایسی قوم کی زبان سیکھنے پر منحصر ہے جس نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے؟ کیا محض یہ زبان سیکھ لینے سے ہم بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے؟

یہ سوال اس وقت بھی زندہ تھا جب سر سید نے قوم کو انگریزی پڑھانے کی ٹھانی تھی لیکن اس وقت قوم ہزیمت خوردہ تھی۔ نااہل سیاسی قیادت، طویل خانہ جنگی، معاشی اور معاشرتی زوال، دینی قوتوں کی شکست اور فاتح انگریز کا جاہ و جلال ان سب عوامل نے اس وقت مسئلے کی حقیقی نوعیت واضح نہیں ہونے دی لیکن اب اسلام کے نام پر ایک ملک حاصل کرنے کے بعد اور اسے ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے عزم اور اعلان کے بعد بھی ہم کیوں نہیں سوچتے کہ ہماری ترقی کا انحصار محض ایک غیر ملکی زبان سیکھنے پر نہیں۔ فن تعلیم و تربیت کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ایک غیر ملکی زبان تعلیم و تعلم میں رکاوٹ ہوتی ہے، ممد نہیں اور اس کے ذریعے تخلیقی سوچ ابھرتی نہیں دب جاتی ہے۔ اس رائے کے حق میں مغربی ماہرین تعلیم کے حوالے بھی دیے جا سکتے ہیں اور ملکی اعداد و شمار سے بھی یہ بات ثابت کی جا سکتی ہے لیکن اختصار اس میں مانع ہے۔

اسی طرح دین کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے ہم یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی قوم کے عروج و زوال کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس میں ایسے اعلیٰ انسانی اوصاف پیدا ہوں جو اسے بنی نوع انسان کے لیے نافع اور اصلح بنا دیں اور یہ اوصاف بہترین انداز میں اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب کوئی قوم ایک صالح نظریہ حیات پر یقین رکھتی ہو اور اس نظریے کو انسانی زندگی میں غالب و نافذ کرنے کے لیے قربانی دینے کا جذبہ رکھتی ہو۔ لیکن ایک ہماری قوم کے بعض عناصر ہیں جو ابھی تک یہی رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ ساری قوم انگریزی پڑھے کہ اس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔

ہماری قوم آزاد ہو جانے کے باوجود مغرب سے کیوں مرعوب ہے اور اسلام جیسے صالح نظریۂ حیات کی بجائے مغربی تہذیب اور انگریزی زبان کو کیوں ترقی کا ذریعہ سمجھتی ہے؟ دراصل اس کا اہتمام بڑی پُرکاری بلکہ عیاری سے ہمارے حکمران طبقے کر رہے ہیں۔ ہمارا حکمران طبقہ جو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بیوروکریسی (سول و ملٹری دونوں) کے بزرجمہروں پر مشتمل ہے، سیکولرزم پر یقین رکھتا ہے اور اپنے ذاتی اور طبقاتی مفادات کا تحفظ اسی میں سمجھتا ہے کہ کوئی حقیقی اسلامی تبدیلی پاکستانی معاشرے اور ریاست میں نہ آئے۔ استعمار نے جانے سے پہلے خصوصی طور پر

یہ طبقات پیدا کیے، ان کی برین واشنگ کی اور اپنے مفادات کی حفاظت ان کے سپرد کی جسے یہ اپنے بقاء کی جنگ سمجھ کر لڑ رہے ہیں اور بھی تک اس میں کامیاب ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار انگریزی کی بالادستی ہے کیونکہ یہ اپنی اولاد کو تعلیم کے لیے مغربی ممالک بھجوادیتے ہیں جہاں وہ کچھ اور سیکھیں نہ سیکھیں انگریزی بہرحال سیکھ لیتے ہیں۔ بطور متبادل انہوں نے اعلیٰ معیار کے انگریزی میڈیم تعلیمی ادارے ملک میں قائم کر رکھے ہیں، جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔

لوگوں کو انگریزی سیکھنے پر مجبور کرنے کا انہوں نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ملک کی اعلیٰ ملازمتیں انہوں نے صرف انگریزی جاننے والوں کے لیے مختص کر رکھی ہیں۔ وہ یوں کہ ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کے لیے انتخاب کا انتظام پبلک سروس کمیشن کے ذمے ہے جس نے امتحان کی زبان انگریزی مقرر کر رکھی ہے۔ اسی کا شاخسانہ یہ بھی ہے کہ ہماری دفتری زبان ابھی تک انگریزی ہے کیونکہ ہمارے صاحب بہادروں کو جتنی اچھی انگریزی آتی ہے اتنی اچھی اردو نہیں آتی۔ لہٰذا پبلک بھی انگریزی استعمال کرنے پر مجبور ہے اور یوں سارا دفتری اور حکومتی نظام انگریزی میں چلتا ہے اور غیر انگریزی دان کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں بنتی۔ انگریزی کے حق میں یہ حالات جان بوجھ کر ہماری نوکر شاہی اور ہمارے حکمران طبقوں نے پیدا کر رکھے ہیں تاکہ ملک میں انگریزی کی بالادستی کے ذریعے ان کی بالادستی قائم رہے۔

پاکستان کے نظام تعلیم پر انگریزی مسلط کرنے کے دو بڑے نقصان ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نئی نسل پر ملی اور اسلامی نظریات کی گرفت کمزور ہوئی ہے۔ مغرب پرستی، مغرب سے مرعوبیت، مغرب کو ترقی اور معیار کی علامت سمجھنا، مغرب کی ہر اچھی بُری بات پر سر دھننا، مغربی ثقافت کی پیروی کرنا اور مغربی طور طریقوں کو اپنانا، سب اسی کا شاخسانہ ہے۔ یورپین ٹائپ انگلش میڈیم سکولوں میں، جہاں ہماری اپر کلاس کے بچے پڑھتے ہیں، اکثر یوں ہوتا ہے کہ مغربی افکار پر مبنی تہذیبی اثرات بچوں کی شخصیت پر غالب آجاتے ہیں اور وہ اسلام اور پاکستانیت کو دقیانوسیت اور لغو سمجھنے لگتے ہیں۔ تاہم درمیانے درجے کے انگلش میڈیم سکولوں اور پہلی جماعت سے لازمی انگریزی والے سکولوں میں بچے کی شخصیت متصادم تہذیبی اور فکری تصورات و افکار کی وجہ سے منتشر ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ نظریاتی طور پر یکسو اور ٹھوس کردار کا حامل شہری بننے کی بجائے ژولیدہ فکری کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی شخصیت کا ڈھانچہ صحیح فکری سمت سے محرومی کی وجہ سے کمزور ہو کر اور متضاد افکار کی آماجگاہ بن کر ٹوٹ پھوٹ کا

شکار ہو جاتا ہے۔

چھوٹی عمر کے مسلمان بچوں کو غیر ملکی زبان کی تدریس کی مخالفت ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ عمر کا انتہائی نازک دور ہوتا ہے یہ وہ وقت ہے جب بچہ دینی اور اخلاقی قدروں کے تصورات اخذ کرنا شروع کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کے ڈھانچے کی تعمیر کی ابتداء ہوتی ہے۔ اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ بچے کے کان میں سب سے پہلی آواز ''اللہ اکبر'' کی پڑے۔ ہماری ماضی کی تعلیمی روایت بھی یہی ہے کہ جب مسلمانوں میں تعلیم کی شرح سو فیصدی تھی اور ان کے ہاں بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور سکول کالج موجود تھے۔ اس وقت بھی ابتدائی تعلیم کا گہوارہ مساجد اور ان میں قائم مکاتب ہوتے تھے۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ بچے کے ذہن میں اسلامی تصورات پختہ ہو جاتے تھے جو باقی ماندہ تعلیمی مراحل میں ساتھ چلتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی آزاد قوم پہلی جماعت سے اپنے بچوں کو کوئی غیر ملکی زبان نہیں پڑھاتی بلکہ ہر قوم اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی فکر کے مطابق اپنے بچوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ پھر جب بچے کی ایک شخصیت بن جاتی ہے، اس کے دینی اور اخلاقی تصورات پختہ ہو جاتے ہیں تو بعد کے تعلیمی مراحل میں حسب ضرورت غیر ملکی زبان یا غیر ملکی ادیان یا غیر ملکی ثقافت و تمدن کا مطالعہ کروایا جاتا ہے لیکن ابتدا ہی میں بچوں کو اپنے دین اور اپنی تہذیب سے متصادم ایک غیر اسلامی افکار کی حامل غیر ملکی زبان پڑھانا نظریاتی خودکشی کے برابر ہے۔ ایسا تو وہی قوم کر سکتی ہے جو کوئی نظریاتی شناخت نہ رکھتی ہو یا نظریاتی شناخت رکھنا نہ چاہتی ہو، جو کسی مخصوص غیر ملکی تہذیب و فکر کو عملاً اپنانا چاہتی ہو اور اسے اپنے ہاں رائج اور نافذ کرنا چاہتی ہو۔ جو قوتیں ہمارے ہاں انگریزی میڈیم یا انگریزی کو پہلی جماعت سے لازمی قرار دینے پر اصرار کرتی ہیں وہ درحقیقت یہی چاہتی ہیں۔ ہمیں افسوس ان اسلامی دانشوروں اور ماہرین تعلیم پر ہے جو اس صورت حال کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں یا معاملے کو سمجھتے تو ہیں لیکن چونکہ خود انہوں نے بھی انگریزی ذریعۂ تعلیم کے سکول کھول کر اسے کاروبار بنا رکھا ہے اس لیے وہ اس معاملے کی نزاکت کو نمایاں نہیں ہونے دیتے اور اس غیر تعمیری رویے کی مزاحمت نہیں کرنا چاہتے۔

پہلی جماعت سے انگریزی کی لازمی تدریس کا فیصلہ ایک اور لحاظ سے بھی غیر حقیقت پسندانہ ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بچے عام طور پر گھروں میں پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی وغیرہ بولتے ہیں۔ سکول جاتے ہی وہ اردو سیکھنا شروع کر دیتے ہیں جو ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ پھر اس چار پانچ سال کی عمر میں

والدین بچوں کو عربی تعلیم یعنی قرآن مجید پڑھانے پر بھی اصرار کرتے ہیں گویا چار پانچ سال کے بچے پر تین زبانوں کا بوجھ پہلے ہی موجود ہوتا ہے۔ اب انگریزی سے مرعوب دانش کہتی ہے کہ اسے انگریزی بھی اسی عمر میں پڑھاؤ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے اور اصولاً یہی نکلنا بھی چاہیے کہ اسے کوئی زبان بھی نہیں آتی، نہ عربی نہ انگریزی اور نہ اردو۔ فنی طور پر یہ بات بہت اہم ہے کہ بچے کے ذہن میں ایک زبان کے لسانی اسالیب (Patterns) پختہ ہوجائیں اس کے بعد اگر کوئی دوسری زبان سکھائی جائے تو وہ نقصان دہ نہ ہوگی۔ بلکہ پہلی زبان کی سیکھی ہوئی لسانی مہارتیں بچے کے کام آئیں گی لیکن جب آپ بیک وقت چار زبانیں ایک معصوم کے سر پر لاد دیتے ہیں تو یہ اس کے ذہنی کمپیوٹر کو کنفیوز کرنے والی بات ہے، نتیجتاً وہ کسی زبان میں بھی مہارت حاصل نہیں کر پاتا۔ اس وجہ سے ماہرین کہتے ہیں کہ پہلے ایک زبان سکھا دی جائے پھر بعد میں دوسری زبانیں سکھائی جائیں۔ چلیے زیادہ سے زیادہ دو زبانیں بیک وقت سکھا دی جائیں لیکن ہمارے حکمران اور مغرب سے مرعوب دانشور تو چار زبانیں بیک وقت اپنے معصوم بچوں کو سکھانے پر مصر ہیں۔ ہماری رائے میں عربی بھی اردو سکھانے کے ایک دو سال بعد سکھائی جانی چاہیے لیکن ایک تو دینی ہونے کی وجہ سے یہ جذباتی معاملہ ہے اور والدین اس پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ دوسرے عربی کے حروف تہجی، رسم الخط اور دوسرے لسانی سانچے اردو سے بہت مختلف نہیں۔ پھر عربی بھی اس عمر میں صرف قرآن پڑھنے کی حد تک سکھائی جاتی ہے دیگر لسانی مہارتوں پر زور نہیں دیا جاتا اس لیے ہم اسے فنی لحاظ سے کسی حد تک قابل قبول سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن یہ آخری حد ہے اس کے بعد بچے پر مزید کسی زبان کا بوجھ ڈالنا ہمارے نزدیک اس پر ظلم کے مترادف ہے اور خصوصاً ایسی زبان کا جو لسانی ساخت کے لحاظ سے بھی اس کے لیے مکمل اجنبی ہو۔

ہمیں ان لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے جو بڑی سادگی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام کوئی زبان سیکھنے سے منع نہیں کرتا، اس کی نظر میں سب زبانیں ایک جیسی ہیں لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فلاں زبان نہیں سیکھنی چاہیے۔ یہ باتیں وہی کہہ سکتا ہے جو تعلیم و تعلم میں زبان کی اہمیت و کردار سے ناواقف ہو۔ کون نہیں جانتا کہ ہر زبان کسی خاص علاقے اور اس کے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی مظہر اور امین ہوتی ہے اور ان اسباب کی وجہ سے ہر زبان کا ایک فکری اور تہذیبی سانچہ بن جاتا ہے جو خون کی طرح اس کی رگوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ برصغیر کی مثال لیجیے سنسکرت یہاں ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی اور اس کے پیچھے صدیوں کا تہذیبی اور تمدنی عمل ہے۔ اب

اگر کوئی کہے کہ سنسکرت کو اس کے تہذیبی و تمدنی پس منظر سے الگ کر کے مسلمانوں کی زبان بنایا جاسکتا ہے اور اردو کو اس کے تہذیبی و تمدنی پس منظر سے الگ کر کے ہندوؤں کی زبان بنایا جاسکتا ہے تو اسے سادہ لوحی ہی کہا جاسکتا ہے۔

اسی طرح انگریزی زبان مغرب کی دینی فکر، اس کی مادہ پرستی، سیکولرزم، سرمایہ داری، لادین جمہوریت اور وہاں کی مادر پدر آزاد معاشرت کا مظہر، امین بلکہ علمبردار ہے۔ اسے مجرد ایک ایسی زبان کی حیثیت سے نہیں لیا جاسکتا جو ان تہذیبی اور فکری اثرات سے خالی ہو۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ہم انگریزی کو اسلامی سانچے یا اسلامی پس منظر میں ڈھال کر پڑھائیں گے تو ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ کام ناقابل یقین حد تک مشکل ضرور ہے کیونکہ کسی زبان کی تشکیلِ نو بڑا وقت طلب اور دقت طلب کام ہے، کسی لیبارٹری میں بٹن دبانے سے نہیں ہوسکتا۔ پھر اس کام کے لیے جس لگن، محنت اور جذبے کی ضرورت ہے وہ ہمارے ہاں سرے سے مفقود ہے۔ ہمارے اسلامی ماہرین تعلیم کی نالائقی کی حد تو یہ ہے کہ ان سے پچھلے پچاس سال میں سکولوں میں انگریزی پڑھانے کے لیے ایک سیریز بھی نہیں لکھی جاسکی۔ انہوں نے انگریزی زبان کا مزاج کیا تبدیل کرنا ہے؟ یہاں تو جناب چھری کاٹے گی خواہ وہ خربوزے پر گرے یا خربوزہ اس پر گرے۔

ایک اور بڑا نقصان جو ہمارے ہاں پہلے انگریزی لازمی کرنے سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ناخواندگی کو فروغ دیا ہے۔ میٹرک میں فیل ہونے والے طلبہ کی اکثریت انگریزی میں فیل ہوتی ہے اور انگریزی چونکہ ایف اے اور بی اے میں بھی لازمی ہے اس لیے نہ صرف یہ کہ ہمارے طلبہ کی ایک بڑی تعداد محض انگریزی کی وجہ سے میٹرک نہیں پاس کرسکتی بلکہ یہ طلبہ اگر کسی طرح رو پیٹ کر میٹرک کر بھی لیں تو انہیں آگے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اعلیٰ تعلیم کی شرح ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اب ہمارے بزرجمہروں نے پہلی جماعت سے انگریزی لازمی کر دینے کا فیصلہ کر تو لیا ہے لیکن ہمیں یہ خدشہ ہے کہ یہ فیصلہ معصوم بچوں کو سکول سے بھگانے میں اہم کردار ادا کرے گا اور ہم خواندگی میں مزید پیچھے رہ جائیں گے بلکہ ناخواندگی کے نئے ریکارڈ قائم کریں گے۔ ایک طرف پنجاب حکومت لازمی تعلیم کا قانون بنارہی ہے (اس پر گفتگو پھر کبھی کہ سارے بچوں کی تعلیم کے لیے حکومت انتظام بھی کرسکتی ہے یا یہ محض اخباری پروپیگنڈہ ہے) اور دوسری طرف بچوں کے لیے ناخوشگوار تعلیمی ماحول پیدا کر کے انہیں سکول سے بھاگنے پر مجبور

کیا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا یا اسے پہلی جماعت سے لازمی کرنا پاکستانی عوام کو ناخواندہ رکھنے کی سازش ہے۔

پاکستان میں انگریزی سکھانے کے حوالے سے جو بات سب سے اہم ہے اور جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہاں انگریزی پڑھانے کے طریقے نہایت فرسودہ اور ازکاررفتہ ہیں ورنہ انگریزی پڑھانے کے مواقع کی کمی نہیں۔ اس وقت بھی سرکاری سکولوں میں چھٹی جماعت سے لے کر بی اے تک انگریزی لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا ہر گریجوایٹ نو سال تک مسلسل انگریزی پڑھتا ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر گریجوایٹ نہ تو انگریزی کی چند سطریں صحیح لکھ سکتے ہیں اور نہ انگریزی بول سکتے ہیں۔ تو اصل خرابی یہ نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو انگریزی نہیں سکھاتے یا انہیں انگریزی سیکھنے کے مواقع میسر نہیں۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی سکھانے کے طریقے دقیانوسی ہیں۔ انگریزی سکھانے کے ماہر اساتذہ موجود نہیں اور اساتذہ کی ٹریننگ کا مناسب انتظام موجود نہیں۔ سمعی و بصری آلات کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ انگریزی پڑھانے کا جو نظام پہلے سے موجود تھا اسے مؤثر بنایا جاتا اور اس کی اصلاح کی جاتی لیکن فیصلہ الٹی سمت میں کیا گیا ہے اور اسے پہلی جماعت سے لازمی کر دیا گیا ہے لیکن حسب معمول تربیت یافتہ اساتذہ کا انتظام سرے سے موجود ہی نہیں لہٰذا یہ کہنے کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں کہ یہ تجربہ بُری طرح ناکام ہوگا۔

ہم آخر میں اپنے مؤقف کو پھر دہراتے ہیں کہ ہمیں انگریزی سے کوئی کد ہے نہ ہمیں انگریزی کی اہمیت سے انکار ہے اور نہ ہم اس تدریس کے مخالف ہیں پاکستان میں انگریزی ضرور پڑھائی جانی چاہیے اور اعلیٰ معیار کی پڑھائی جانی چاہیے لیکن سب کو نہیں ضرورت مندوں کو اور وہ بھی مناسب وقت پر۔ اپنی نظریاتی اور ملی سرحدوں کے تحفظ پر اصرار ہماری بقاء اور استحکام کا مسئلہ ہے۔ ہمارا یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ ہماری نئی نسل کو پہلے اچھا مسلمان اور اچھا پاکستانی بننا ہے باقی باتیں اس کے بعد آئیں گی۔ لاریب ہمیں اس دنیا میں ترقی بھی کرنی ہے اور سربلند رہنے کے لیے جدوجہد بھی کرنی ہے لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اپنے نظریۂ حیات سے جڑے رہیں۔ جب نئی نسلوں کی شخصیت کی تعمیر اسلام اور نظریہ پاکستان کی بنیاد پر ہو، جب انہیں اپنے ماضی پر فخر اور مستقبل پر یقین ہو۔ اس کے برعکس اگر ہم نے اپنے بچوں کو

مغرب کا گرویدہ اور اس سے مرعوب بنادیا۔ بچپن ہی سے اپنے بچوں میں غیر ملکی زبان کے ذریعے اسلام مخالف تصورات کی آبیاری کردی تو وہ کیسے سچے مسلمان اور پاکستانی بنیں گے؟

اندریں حالات ہماری تجویز یہ ہے کہ ملک میں انگریزی میڈیم سکولوں پر بغیر کسی استثنٰی کے فی الفور پابندی لگادی جائے۔ ثانوی سطح سے انگریزی کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھنے کی اجازت ہو۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان کی اسلامی اور پاکستان کے تناظر میں تدریس کے لیے ایسے ماہرین تعلیم کی زیرنگرانی انگریزی کا نصاب اور نصابی کتب ازسرنو مدون کی جائیں جو اسلام اور نظریہ پاکستان پر پختہ یقین رکھتے ہوں۔ علاوہ ازیں انگریزی کی مؤثر تدریس کے لیے اساتذہ کی ٹریننگ کے پروگرام وضع کیے جائیں اور سمعی و بصری وسائل کے ساتھ تدریس کے جدید انداز اپنائے جائیں تاکہ جو طالب علم بھی انگریزی پڑھنا چاہے اسے تھوڑے عرصے میں اس زبان پر ماہرانہ گرفت حاصل ہوجائے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ نہ کیا گیا تو جس طرح پہلے نو سال کی تدریس کے بعد بھی بچوں کو انگریزی نہیں آتی تھی، اب چودہ سال کی تدریس کے بعد بھی نہیں آئے گی، ناخواندگی میں زبردست اضافہ ہوگا، اسلام اور نظریہ پاکستان سے بُعد پیدا ہوگا اور ایک ایسی نسل پروان چڑھے گی جو آدھی تیتر آدھی بٹیر ہوگی، نظریاتی لحاظ سے عدم یکسوئی کا شکار ہوگی تو کردار کے لحاظ سے بودی اور کمزور۔

{..}

(صفحہ نمبر ٦ کا بقیہ) سید مودودی اور تعلیم

اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملاکر پڑھائیں گے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہوں گے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائے گا۔

کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریٹ کی طرف چلا جائے گا بلکہ ''کامریڈیٹ'' تک پہنچ جائے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان مذبذب ہوکر مضمحل ہوجائے گا۔ بہت ہی کم آدمی اس نظامِ تعلیم سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بناسکیں۔ اور ان کا بھی اس قدر طاقت ور ہونا بہت مشکل ہے کہ اٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری

طرف پھیر دیں۔

ڈاکٹر محمد امین

دینی سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے لیے

مجوزہ متفقہ پروگرام

۱۔ انتخابی اتحاد

۔ پوری کوشش کی جائے گی کہ ایک نشست پر دینی جماعتوں کے امیدوار مدمقابل نہ ہوں۔

۔ جہاں مجوزہ اتحاد کا کوئی امیدوار ہوگا وہاں ساری جماعتیں مل کر اس کی حمایت کریں گی اور اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں گی۔

۔ کسی دوسری سیاسی جماعت یا گروپ کی حمایت یا اس سے اتحاد کا فیصلہ محض انتخابات یا نشستوں کے لیے نہیں ہوگا بلکہ کچھ اصولی اور اسلامی مطالبات اس سے منوائے جائیں گے جن کا فیصلہ باہمی مشاورت سے ہوگا۔

۔ طریق انتخاب میں ان رکاوٹوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی جو غیر اسلامی اور غیر جمہوری ہیں اور اسلامی جماعتوں کو ووٹ نہ ملنے کا سبب بنتی ہیں جیسے انتخابی مہم میں دولت، برادری اور لسانی اثرات، آئین کے آرٹیکل ۶۲، ۶۳ پر عمل نہ ہونا۔۔۔۔۔وغیرہ۔

۲۔ طریق کار

سیاسی جدوجہد

i۔ کامیابی کی صورت میں اگر اتحاد کو مرکز یا کسی صوبے میں اکثریت حاصل ہوگئی تو وہاں نفاذِ شریعت کے لیے وہ تمام اقدامات کیے جائیں گے جو ملی مجلس شرعی کے زیر اہتمام سارے مکاتب فکر کے 55 علماء کرام نے 15 متفقہ نکات کی صورت میں منظور کیے ہیں اور جو 1951ء میں 31 علماء کرام کے منظور کردہ متفقہ 22 نکات پر مبنی ہیں۔

ii۔ کامیاب نہ ہونے کی صورت میں باہم مل کر پارلیمنٹ میں جدوجہد کرنا اور حکومت سے ایک منصوبہ بندی کے تحت مختلف اسلامی مطالبات منوانا

۲۔ عوامی جدوجہد

i۔ عوامی سطح پر خود کو منظم کر کے مختلف اصلاحی اقدامات کرنا مثلاً جدید تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنا، دینی تعلیم کو مزید مؤثر بنانے کے لیے اس پر نظر ثانی کرنا، ذرائع ابلاغ کی نگرانی، اصلاح اور مناسب پروگراموں کی تیاری، تعمیر و اصلاح اخلاق کے لیے محلہ/گاؤں کی سطح پر کمیٹیاں بنا کر انہیں فعال کرنا۔۔۔وغیرہ

ii۔ عوامی سطح پر منظم ہو کر خدمت خلق یعنی مسلمانوں کے دکھ درد دور کرنے کے اقدامات کرنا مثلاً محلہ/گاؤں کی سطح پر کمیٹی بنا کر بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کی مالی مدد کرنا، مریضوں کے علاج کی کوشش کرنا، شرعی/مصالحتی عدالتوں کا ملک بھر میں قیام اور مظلوموں کی مدد، چوری ڈاکوں سے بچنے کے لیے ہر محلے/گاؤں کی سطح پر امن کمیٹی کا قیام اور اپنی مدد آپ کے تحت پہرے کا انتظام ۔۔۔وغیرہ

۳۔ تھنک ٹینک کا قیام

۔ ملک بھر کے چیدہ دانشوروں اور ماہرین پر مشتمل ایک تھنک ٹینک بنا دیا جائے جو ہوم ورک کرے اور مجوزہ اتحاد کے لیے حکمت عملی اور تفصیلی لائحہ عمل بنانے کا کام مستقل بنیادوں پر کرتا رہے۔ یہ تھنک ٹینک ابتداء ہی میں بنا دیا جائے تا کہ وہ کام شروع کر دے اور اتحاد کی مرکزی کونسل کے غور وخوض کے لیے تجاویز تیار کرتا رہے۔

....

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے !

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں کہ روشِ بندہ پروری کیا ہے !

کسے نہیں ہے تمنائے سروری ، لیکن

خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے!

دینی سیاسیات ڈاکٹر محمد امین

کیا جمہوریت کے ذریعے اسلامی انقلاب آ سکتا ہے؟

البرہان کے سابقہ شمارے میں مندرجہ بالا موضوع پر کراچی کے دو دانشوروں کے نقطۂ نظر کا ذکر ہوا تھا۔ شاہنواز فاروقی صاحب نے جماعت اسلامی کی اس امکانی قوت کا ذکر کیا تھا جو وہ اسلامی انقلاب لانے کے حوالے سے رکھتی ہے اور ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کی رائے یہ تھی کہ جماعت موجودہ سیاسی حکمت عملی کے ذریعے نہیں جیت سکتی بلکہ اسے سماجی تبدیلی کی طرف آنا چاہیے۔

ہم اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے ابتداء ہی میں واضح کردیں کہ بات 'ایشو' پر ہونی چاہیے اور یہ 'ایشو' صرف جماعت اسلامی کا نہیں بلکہ ساری دینی سیاسی جماعتیں اس کی مخاطب ہیں۔

۱۔ پاکستان بننے کے بعد جب دینی عناصر پاکستان میں حکومت الٰہیہ/ اسلامی انقلاب/ غلبۂ اسلام/ اسلامی نظام/ نفاذ شریعت/ نظام مصطفی۔۔۔ کے لیے عملی سیاسی جدوجہد کا لائحہ عمل بنا رہے تھے تو دو امور کی طرف وہ زیادہ توجہ نہیں دے سکے:

ایک: تو یہ کہ جس 'مغربی جمہوریت' میں چند اسلامی اصول شامل کرکے وہ اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے رہے تھے اور اس مغربی جمہوریت کے بنائے ہوئے سیاسی اداروں کے تحت سیاسی جدوجہد کرنے جارہے تھے وہ مغربی جمہوریت **اولاً** ایسے افکار ونظریات کی پیداوار تھی (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، ایمپریسیزم وغیرہ) جو اصلاً اسلام مخالف اور دین دشمن تھے اور اس کے قائم کیے ہوئے اداروں کے تحت جدوجہد کرکے منطقی طور پر مغربی فکر وتہذیب کو فروغ ملتا نہ کہ اسلامی اصول واقدار کو۔ ثانیاً اس مغربی جمہوریت کے پشتیبان مغربی ممالک اسلام اور مسلم دشمن تھے۔ انہوں نے اسلامی ملکوں کی 'جغرافیائی آزادی' کو مجبوراً گوارا کیا تھا اور وہ نوزائیدہ مسلم ممالک میں اپنی مرضی کی قیادت کے لانے، مسلمانوں کے دل و ماغ فتح کرنے اور وہاں مغربی فکر وتہذیب رائج کرنے کے لیے ہر جائز وناجائز حربہ اور ترغیب وترہیب کے سارے ذرائع استعمال کرنے والے تھے۔

دوسرے: مسلم معاشرے کی اپنی ایک تاریخ ہے جس کے سیاسی رویوں میں سے دو بہت اہم ہیں۔

ایک یہ کہ مسلم ریاستوں میں اسلامی تصورِ شورائیت کے اس پہلو پر کم ہی عمل درآمد ہوا ہے کہ حکومت عام مسلمانوں کے مشورے سے بنی اور ہٹنی چاہیے اور دوسرے بعض مخصوص حالات میں علماء وصلحاء نے حکومت بنانے اور چلانے میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور تعلیم و تزکیہ کے شعبوں میں مصروفِ عمل رہے۔ یہ دونوں باتیں اسلامی آئیڈیلز کے خلاف ہیں لیکن زمینی حقائق ہیں اور ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا علماء کرام اور دینی عناصر جب پچھلے تیرہ سو سال کی مسلم روایت سے انحراف کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئے تاکہ ریاست کی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں تو اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنی بھی اصلاح کرتے اور مسلم معاشرے کی بھی کیونکہ نہ مسلم معاشرہ پچھلے تیرہ سو سال سے اس سیاسی منہج کا عادی رہا تھا اور نہ وہ خود۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے نہ مسلم معاشرے کی اصلاح کی اور نہ اپنی۔ معاشرے کی اصلاح یہ مطلوب تھی کہ لوگوں کو دین پر عمل کا سچا طالب بنا دیا جاتا اور اس ضمن میں علماء کی حکومت کی ضرورت ان پر واضح کر دی جاتی ۔ اور خود علماء کو اپنی اصلاح یہ مطلوب تھی کہ اگر وہ لوگوں کی دنیا بہتر بنانے اور اسے اسلام کے مطابق چلانے نکلے تھے تو ان کے دنیاوی معاملات میں دلچسپی لیتے، ان کے دکھ درد اور مسائل ومشکلات میں ان کا ہاتھ بٹاتے لیکن علماء کرام اور دینی عناصر نے یہ دونوں کام نہ کیے اور صرف سیاسی عمل میں حصہ لینے کو انہوں نے کافی جانا اور وہ بھی اپنے اپنے مسلک کی جماعت بنا کر، بغیر متحد ہوئے۔

ان دونوں امور کو کما حقہ توجہ نہ دینے اور انہیں پیشِ نظر رکھ کر اپنی حکمتِ عملی اور لائحہ عمل ترتیب نہ دینے کے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو یہ کہ علماء اور دینی عناصر سیاست میں ناکام ہو گئے اور دوسرے یہ کہ معاشرہ دین سے دور ہو گیا ہے اور مغربی فکر وتہذیب کا معاشرے پر غلبہ ہو گیا ہے۔ لہٰذا کوئی خوابوں اور تمناؤں کی دنیا میں جینا چاہے تو اس کی مرضی ورنہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ جماعت اسلامی تو رہی ایک طرف پاکستان کی ساری دینی جماعتیں (دل سے بھی مل جائیں جس کے بظاہر امکانات موجود نہیں) تو بھی وہ پاکستان کے سیاسی حالات پر اثر انداز ہو کر کوئی بڑی اور فوری تبدیلی (اسلامی تناظر میں) نہیں لا سکتیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتیں:

۱۔ اصلاحِ معاشرہ کا کام کریں۔ اس کا ایک بڑا ذریعہ نظامِ تعلیم وتربیت ہے لیکن وہ خود اصلاح طلب ہے۔ جدید تعلیم کو مغرب کے منہاج سے نکال کر اسلام کے عصری تقاضوں کے مطابق اس کی

تشکیلِ نو ناگزیر ہے اور دینی مدارس کی تعلیم کو بھی مؤثر بنانے اور عصری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اس پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تعلیم کو عام کیا جائے۔ نیز پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کی اصلاح کی جائے اور مسجد کو مرکز بنا کر عوام کی اخلاقی تربیت وتزکیہ کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ دینی عناصر عوام کے دکھ درد میں شریک ہونے کو اپنا وطیرہ بنائیں اور خدمت خلق کو اپنائیں۔ غربت و افلاس کو کم کرنے کی کوشش کریں اور بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کا سہارا بنیں۔ مظلوموں اور پسے ہوئے طبقات کا ساتھ دیں۔ شرعی عدالتیں قائم کر کے انصاف مہیا کرنے میں عوام کی مدد کریں اور پہرے داری کا نظام قائم کر کے امن و امان بحال کرنے میں مدد دیں۔

معاشرے کی اصلاح اور خدمت خلق، یہ دونوں شرعی لحاظ سے مطلوب ہیں خواہ دینی عناصر اقتدار میں ہوں یا نہ ہوں۔ ہم یہ تجویز دے رہے ہیں کہ وہ سماجی تبدیلی کے ان کاموں کو اہمیت دیں اور اپنی حکمت عملی کا باقاعدہ جزو بنائیں اور یہ کام باقاعدہ منصوبہ بندی سے کریں۔

۳۔ سیاسی جماعت بنا کر الیکشن لڑنا اور اقتدار کے لیے جدوجہد کرنا ریاستی قوت کو اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوئی واحد صورت نہیں۔ اس کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں اور ان پر غور کیا جاسکتا ہے۔ تاہم علماء کرام اور دینی عناصر اگر اسے موجودہ صورت ہی میں جاری رکھنے کو اپنی مجبوری سمجھیں تو کامیابی کے امکانات کو ممکن بنانے کے لیے مندرجہ بالا دو کاموں کے علاوہ، انہیں ایک تو متحد ہونا چاہیے (کہ اگر وہ الگ الگ رہے تو ماضی کی طرح پٹتے رہیں گے) اور دوسرے وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے مل کر تحریک چلائیں جو انتخابات میں حقیقی رائے عامہ کو اوپر آنے میں رکاوٹ ہیں مثلاً آئین کی دفعات 62، 63 پر عمل نہ ہونا، انتخابات میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی طرف سے دولت کا ناجائز استعمال اور برادری و قبیلے کا کردار یا متناسب نمائندگی کا نظام اپنانا ۔۔۔ وغیرہ

۴۔ اوپر کے تینوں کام اس انداز سے کیے جائیں کہ اسلامی اصول و اقدار کی بالادستی ہو اور مغربی فکر وتہذیب کا رد ہو کیونکہ جب تک ہم شعوری طور پر مغربی فکر وتہذیب اور اس کے مظاہر کو رد نہیں کریں گے اسلام کے لیے مؤثر انداز میں کام نہ کرسکیں گے۔ ویسے بھی کلمۂ طیبہ کا تقاضا یہی ہے کہ ہم پہلے جھوٹے خداؤں کی نفی کریں اور پھر ایک خدا کا اثبات۔

خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں مغربی جمہوریت یا اس سے ملتے جلتے جمہوری نظام میں محض سیاسی

جدوجہد کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آسکتا اور اسلامی لحاظ سے کوئی مؤثر اور دیرپا تبدیلی لانا پیش نظر ہو تو تعلیم و تربیت کے ذریعے معاشرے کی اصلاح اور خدمت خلق شرط ہے۔

اسلام اور مغرب　　سید خالد جامعی

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس (۲)

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

۱۴۔ الٰہی مابعد الطبیعیات اور مادی مابعد الطبیعیات

اٹھارہویں صدی میں مغرب نے علیت کو مابعد الطبیعیات پر فوقیت دے کر علیت کے ذریعے مابعد الطبیعیات اخذ کرنے کی روایت قائم کی جس کے نتیجے میں ایک نئی مابعد الطبیعیات وجود میں آئی جس میں انسان ہی مرکز کائنات قرار پایا۔ وہی علم کا ماخذ، منبع اور سرچشمہ ٹھہرا۔ وہ کسی خارجی ذریعہ علم کا محتاج نہیں رہا۔ علم کا مرکز اس کائنات کے باہر عالم اکبر نہیں اس کائنات کے اندر اور خود عالم اصغر انسان کے اندر منتقل ہو گیا اور حصول علم کے لیے انسان کا رشتہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ آسمان سے، خارج سے، باہر سے منقطع ہو کر عالمِ ارذل و اسفل سے جوڑ دیا گیا۔ اس جعلی مابعد الطبیعیات [Pseudo metaphysics] کے نتیجے میں کائنات کا محور حقیقت مطلق، حقیقت الحقائق، حقیقت اولیٰ، اور اللہ کے بجائے اب صرف اور صرف انسان قرار پایا لہٰذا آزادی کے نام پر انسان پرستی کے فلسفے نے جگہ لی جس کی مختلف شکلیں انفرادیت پرستی، مادہ پرستی، نتائجیت پرستی، لذت پرستی، سرمایہ پرستی وغیرہ وجود میں آئیں۔

۱۵۔ ٹیکنو سائنس اسلامی مقصدِ حیات کو ہرگز پورا نہیں کرسکتا

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالمِ اسلام کا اصل مسئلہ نفوس کا تزکیہ، تطہیر قلب، طہارت نفس، معرفت رب اور فکر آخرت کے بجائے صرف اور صرف فکر دنیا ہے یعنی اس زندگی کو کیسے بسر کیا جائے اس میں سہولتیں، لذتیں اور آرام کی کہکشاں کیسے سجائی جائے۔ اکیسویں صدی کی مسلم امت ٹیکنالوجی کی بے دریغ حمایت کے ذریعے اپنے اُس ارادے کا اظہار کرتی ہے کہ وہ دنیا فرعون کی طرح بسر کرے لیکن اس کا آخرت میں انجام حضرت موسیٰؑ کی طرح ہو۔ جو لوگ پیغمبروں کے ساتھ اپنا انجام

چاہتے ہیں انھیں پیغمبروں کا طرزِ زندگی اختیار کرنا پڑے گا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا فرعون کی اتباع میں بسر کریں اور ان کا انجام پیغمبروں کے ساتھ ہو۔اس خواہش کا دوسرا نام مغرب ومشرق میں پُل کی تعمیر،مشرق ومغرب میں مکالمہ،مشرق ومغرب میں مفاہمت ، ہم آہنگی،مشترکہ عناصر کی تلاش ہے۔ عالمِ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مغرب نے دنیاوی لذتوں اورسہولتوں کے لئے جوٹیکنو سائنس ایجاد کی ہے اس کی تمام مصنوعات وہ حاصل کرلےلیکن اس کے اندر اسلام کی روحانیت داخل کردے۔لیکن انھیں نہیں معلوم کہ ٹرائے کی جنگ کےٹروجن ہارس [Trogen Horse] کے پیٹ میں اس تہذیب کی مابعد الطبیعیات، تاریخ اور فلسفے کا لشکر چھپا ہوا ہوتا ہے جس تہذیب نے وہ گھوڑا تخلیق کیا ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ گھوڑا کوئی بھی تخلیق کرلے ہم اس پر بسم اللہ پڑھ کرسوار ہوتے ہوئے اسے اپنی اقدار کے مطابق ڈھال لیں گے۔ٹیکنو سائنس کی ایجادات غیر اقداری نہیں ہوتیں، یہ خالص اقداری ہوتی ہیں۔ یہ تلوار، چھری یا خنجر یا نشتر نہیں ٹیکنو سائنس ہے اس میں سرمایہ داری کے سوا کوئی اور قدر داخل نہیں کی جاسکتی۔

۱۶۔ ٹیکنالوجی کی وجودی اقدار کو بدلا نہیں جاسکتا

کسی بھی ٹیکنالوجی میں قدر اس کے خیالی تصورِتعمیر،تشکیل،تخلیق [Creation Process] کے وقت تو داخل کی جاسکتی ہے لیکن جب وہ ایجاد تیار ہوکر بازار میں فروخت [Cosumption Purpose] کے لئے آجائے تو اس موقع پر اس بنی بنائی ڈھلی ڈھلائی ٹیکنالوجی کو اسلام کی روحانیت میں ڈھالنے کا عمل یا خواہش ، آرزو، جستجو اور گفتگو مشق رائیگاں ہے۔مثلاً موبائل فون بن گیا۔ یہ کیوں بنا، کیسے بنا، کس لئے بنا، کس نے بنایا، کتنے کھرب روپے خرچ کرکے بنایا، اس کے لئے امریکی محکمہ دفاع (پینٹاگون) نے کتنے کھرب کی سرمایہ کاری کی؟ یہ تمام مباحث فون استعمال کرنے والے فرد، قوم،تہذیب کے لوگوں کے لئے عموماً اجنبی اور غیر مانوس ہی رہتے ہیں لیکن وہ اس میں اذان ،نعت، تلاوت کی آوازیں ڈال کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس آلے کی مادیت کو روحانیت سے بدل دیا۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ موبائل فون میں ان چیزوں کے داخل اور شامل ہونے سے اس کی مابعد الطبیعیاتی ساخت، رخ، نہج پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ تو محض اضافی کام ہے جو وہ اس ایجاد کے ساتھ کررہے ہیں اس اضافی کام [Addition] سے فون کی قدر میں کوئی اضافہ [Value Addition] نہیں ہورہا نہ فون کی اقدار بدل رہی ہیں کیونکہ قدر تو ایجاد کے تخیل کے ساتھ ہی اس میں باطنی طور پر سمو دی گئی اسے خارجی ذریعے سے سمونا محال ہے۔ اس فون کی قدر

[Value] آزادی اور سرمایہ کا ارتکاز ہے لہٰذا فون میں اذان ،نعت ،تلاوت کی آوازیں شامل کرنے والا ان اسلامی لاحقوں سابقوں کے ساتھ آزادی اور ارتکاز سرمایہ کے مابعد الطبیعیاتی عمل میں بھی شریک ہے۔ وہ اس نظام کا حصہ ہے اس کی شخصیت، اسلامیت، روایت اس نظام میں آج نہیں تو کل تحلیل ہوجائے گی یہ اقداری ایجاد [Value Loaded Invention] اسے اس کے خاندان اوراس کی نسلوں کو اس طرح بدل [Transform] کر رکھ دے گی کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا مثلاً موبائل فون استعمال کرنے والا جہاں مدعو ہوتا ہے، جس دعوت میں مہمان کے طور پر شریک ہوتا ہے اسلامی آداب کے تحت مہمان و میزبان کی مجلس اوران کے تخلیے میں کسی کو میزبان کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں کیوں کہ یہ اس کے وقت اور خرچ کا زیاں ہے لیکن آپ مہمان کسی اور کے ہوتے ہیں میزبان تخلیے میں آپ سے ہم کلام ہوتا ہے اور آپ اس کی اجازت کے بغیر اس کی موجودگی میں موبائل فون پر اپنے کئی مہمانوں کی میزبانی کا فریضہ اپنے میزبان کے قیمتی اوقات میں انجام دیتے ہیں۔گفتگو اور خیالات کا تسلسل اس مداخلت کے باعث بار بار ٹوٹتا ہے۔ میزبان نے خود کو آپ کے لیے فارغ کیا لیکن آپ خود کو کسی اور کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ پلاسٹک کے ایک کھلونے نے صدیوں کی روایت، اسلامی اخلاقیات اور اصول وآداب لمحوں میں تبدیل کردیے مگر بدل جانے والے کو احساس تک نہیں ہوا۔مسجد میں لوگ نماز پڑھنے جاتے ہیں حتیٰ کہ حدود حرم اور روضۂ نبویؐ کے اندر بھی وہ اس فون کی آواز بند کرنا بھول جاتے ہیں۔اکثر یہ آوازیں موسیقی کی ہوتی ہیں۔فون ان کو دنیا سے اس طرح جوڑتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہوئے دنیا سے دوری گوارا نہیں کرتے۔ خانۂ کعبہ میں حاضری کے باوجود وہ حضوری کی لذت سے نہ صرف محروم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کی لذت حضوری میں بھی اپنی حرکات سے خلل پیدا کرتے ہیں۔ اکثر مذہبی لوگوں کو دیکھا گیا کہ وہ نماز ختم ہونے کے فوراً بعد دعا سے پہلے فون نکال کر پیغامات پڑھتے ہیں یا نماز پڑھتے ہی، دعا مانگے بغیر،فوراً باہر نکل کر بات شروع کردیتے ہیں۔نماز کے دوران فون کی آواز بند کرتے ہیں مگر پیغامات وصول کرنے کا نظام کھلا رکھتے ہیں۔ جب بھی پیغام وصول ہوتا ہے ایک خفیف سی آواز مسجد کے مقدس ماحول کو مکدر کردیتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم جب اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف چلتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے والے چند لمحات میں بھی دنیا سے تعلق منقطع نہیں کرنا چاہتے لہٰذا عموماً نمازی موبائل فون مسجد میں بھی کھلے رکھتے ہیں خواہ ان کی آواز بند [Silent] ہو۔ دنیا سے تعلق کی یہ نوعیت کہ آدمی اپنے رب سے راز و نیاز کے وقت بھی دنیا سے

بے نیاز نہ ہوسکے اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹیکنو سائنس آخرت پر دنیا کے غلبے کو ممکن بناتی ہے۔ انسان دنیا کو اس کے ذریعے اپنی عبادت گاہ میں اور خلوت وتنہائی میں بھی لے آتا ہے کیا یہ عمل مادیت پرستی کی تعریف میں نہیں آتا؟ اکثر لوگ مسجد کے اندر ہی دعا کے بعد اپنے ہاتھ موبائل فون تک پہنچا دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نماز کے لیے مسجد میں آرہے ہیں جماعت کھڑی ہورہی ہے مگر فون پر آخری ہدایات دی جارہی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سنّتوں کے وقفے میں کوئی پیغام موصول ہوا تو فوراً مسجد سے باہر نکل کر گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔ بہت سے نیک نفوس باہر جا کر بات چیت کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے جوابی پیغام روانہ کردیتے ہیں۔ یہ اعمال اب عام مساجد سے لے کر بیت اللہ اور مسجدِ نبویؐ تک وبائے عام کا درجہ اختیار کرچکے ہیں، تو کیا ٹیکنالوجی نے ہماری اقدار، روایات، رویوں، صدیوں کے معمولات پر کوئی اثر نہیں ڈالا؟ اس اثر کو روکنے کی کوئی ٹیکنالوجی ہمارے لوگوں نے ایجاد کی ہو تو وہ پیش کی جائے مغرب نے بینکوں میں ڈکیتیوں کو روکنے کے لئے ایک نظام وضع کیا ہے جس کے تحت بینک میں داخل ہوتے ہوئے اگر آپ موبائل فون بند کرنا بھول جائیں تو اس کا حافظہ [Memory] سلب کرلیا جاتا ہے اور اس کے اعمال [Functions] بینک کی عمارت کے اندر معطل کردیے جاتے ہیں۔ SMS کے ذریعے آپ کی آزادی اور تخلیے میں بلا وجہ ہر شخص، ادارہ اور کمپنی دخل اندازی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو وہ خبریں اور وہ لوازمہ بھی پڑھنے پر مجبور کردیا جاتا ہے جن کا ذکر سننا آپ کو گوارا نہیں ــــ اس جبر کا نام آزادی ہے اور یہ آزادی سب کو پسند ہے۔ موبائل فون استعمال کرنے کے اسلامی آداب پر کتابچے شائع کیے جارہے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں طبعی علوم (Sciences) ایک قلیل گروہ کی دلچسپیوں کا مرکز تھے۔ تین سال کی عمر کے بچے سے لے کر اسّی سال کے بوڑھے کو ان علوم کی جبری تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ جو ان علوم میں دلچسپی لیتا اسے روکا بھی نہیں جاتا تھا لیکن ریاست، حکومت، معاشرت اور معاشرے کی تمام قوتیں، جہتیں اور توانائیاں صرف طبعی علوم [Physical Sciences] کے لیے وقف نہ تھیں لوگ اساسی نقلی علوم [Real Knowledge] کو اہم ترین سمجھتے تھے اور آخرت کو بہتر بنانے والے علوم پر ان کی توجہ مرکوز تھی لہٰذا طبعی علوم میں اگر محیر العقول ترقی کے مظاہر و مناظر ہمیں روایتی تہذیبوں میں نظر نہیں آتے تو اس کا سبب اس عہد کے مابعد الطبیعیاتی تناظر کا جدید مغرب کے جعلی مابعد الطبیعیاتی تناظر [Pseudo Metaphysical Perspective] سے یکسر مختلف ہونا ہے۔

۱۷۔ ٹیکنو سائنس آخرت کی نفی کرتی ہے

قدیم تہذیبوں میں دنیاوی، مادی، عقلی اور حسی علوم کی تقلیل کا رویہ تھا جبکہ جدید مغرب کی ذہنی کیفیت اس کے برعکس مذہب کی تقلیل بلکہ مذہب سے انحراف اور مذہب کے مکمل اخراج سے عبارت ہے۔ ٹیکنو سائنس کے ذریعے ہر ممکنہ حد تک مذہب کا دائرہ محدود اور تنگ کر کے اسے باقی زندگی سے اس طرح علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر باقی نہیں رہا۔ ٹیکنو سائنس پر مبنی طرزِ زندگی جدید انسان کو حق کی سطح تک بلند کرنے کے بجائے حق کو اپنی سطح تک کھینچ لانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ الحق عہد حاضر پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس کے سامنے سپر انداز ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اور اصول کا ٹیکنو سائنس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور خود کو اس کے سپرد کر دینا اور سپردگی، بندگی اور فریب خوردگی عقل کا تقاضا اور ایمان کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم خود کو جدید سہولیات پر مبنی معاشروں کے باعث نہایت خوش قسمت تصور کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی تنگ و تاریک، بے جہت، بے سمت، یک رخی اور اندھی دنیا میں زندہ ہیں جہاں اندھے ہی اندھوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ اور اگر ان رہنماؤں کو اس موقع پر نہ روکا گیا تو وہ دنیا کو پاتال میں پہنچا دیں گے۔ عالمِ اسلام میں جدیدیت، مغربیت، ٹیکنو سائنس کے حامی اکثر لوگوں کی حالت فی الحقیقت اس سے مختلف نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کے بارے میں ہماری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت کا ایک اہم سبب ویلفیئر ازم اور لبرل ازم ہے جس نے زندگی کا مقصد محض فلاح و بہبود کو قرار دیا لیکن نجات اخروی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان کسی تہذیب میں ہو اس کے لیے دنیا اہم بنا دی گئی ہے اور آخرت انتہائی غیر اہم۔ دین کا مقصد فلاح و بہبود نہیں بلکہ نجات اخروی ہے۔ صرف ترقی، فلاح، مادی کامیابی اور مستقبل پر ایمان کا ایمان باللہ سے کوئی تعلق نہیں ـــــ دینی تہذیب میں حصول نجات سب سے اہم کام ہے ـــــ انسان اس کے لیے اپنی دنیا اور معیارات زندگی کو ترک کر دیتا ہے۔ جب آخرت اہم ہوتی ہے تو دنیا غیر اہم ہو جاتی ہے۔ روایتی تہذیبوں میں اسی لئے ٹیکنو سائنس پیدا نہیں ہو سکی کیوں کہ ان تہذیبوں کا نقطۂ ماسکہ اور مقصد زندگی اس دنیا میں آزادی اور لذتوں کا حصول نہیں تھا۔ ٹیکنو سائنس جہاں جاتی ہے وہاں آخرت کی فکر کو ناممکن اور محال بنا دیتی ہے اور زندگی کے بارے میں غور و فکر اور معیارات زندگی میں شب و روز اضافہ کی فکر کو ہر کہہ و مہہ کے لئے ممکن بنا دیتی ہے۔ دنیاوی فلاح ترقی تعیّشات یا نجات ـــــ جب یہ سوال مذہب کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے تو نجات کو اولیت دی جاتی ہے لیکن جب عقل کی عدالت، سرمایے کے ذریعے اور ٹیکنو سائنس کے طریقوں سے اس سوال کا جواب دیتی ہے تو نجات کا سلسلہ اس کے دائرۂ علم سے خارج ہو جاتا ہے۔ ہمیں صرف ان اشیاء و

آلات وایجادات کی فکر ہے جن کی کمی سے شاید ہماری مادی زندگی میں کچھ خلل پیدا ہو لیکن ہمیں ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہے جو ہماری روح کو مسخ کر کے اسے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ایسی اشیاء کی فہرست میں ٹیکنو سائنس کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔

۱۸۔ سائنس اور تجربیت کے فروغ میں ہیوم اور کانٹ کا کردار

جدید سائنس کے فروغ میں ایڈورڈ ہیوم کا بنیادی کردار ہے جو تجربیت [Empiricism] کا بہت بڑا حامی تھا اور جس نے Analytical proposition اور synthetic proposition کا تجزیہ پیش کر کے عقلیت سے حاصل ہونے والے علم کو رد کیا اور بتایا کہ عقلیت پسندی [Rationalism] صرف اور صرف [Analytical Proposition] پر قائم ہے جس سے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور عقلیت پسند [Rationalists] عام لوگوں کو محض بے بنیاد دلائل کے ذریعے مسخر کرنے کا فن جانتے ہیں۔ کانٹ پر ہیوم کا بہت اثر ہے کیوں کہ کانٹ نے جب ہیوم کے مباحث پڑھے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھا ''ہیوم نے مجھے سوتے سے اٹھا دیا ہے''۔ ہیوم کے فلسفیانہ دلائل نے کانٹ کو مسخر کیا اور اس نے ''تنقید عقل محض'' میں عقلیت پرستی کے فلسفے کی دھجیاں بکھیر دیں اور بتایا کہ انسان نے تین تاریخی غلطیاں کی ہیں کہ اس نے الٰہیات، کونیات اور نفس انسانی کو عقلیت کے دائرے میں جانچنے، پرکھنے اور ثابت کرنے کی کوشش کی جب کہ ان دائروں میں عقل کار آمد نہیں ہے۔ انسان نے ان دائروں میں عقل کا اطلاق کر کے در حقیقت ایک فاش غلطی (Categorical mistake) کی ہے کیونکہ یہ دائرے عقل انسانی کے ادراک سے ماورا ہیں۔ انسانوں نے تاریخ کے ہر دور میں عقل کا اطلاق ایسے دائرہ ہائے علم پر کیا جو عقل کے ادراک اور تصور سے باہر تھے لہٰذا انسان نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل محض'' اسی مدعا کا علمی اظہار ہے۔

۱۔ Analytical proposition کے زمرے کے جملوں کی چار خصوصیات ہیں۔ ۱۔ یہ جملے بغیر تجربے کے [A prarie] ہوں گے۔ ان جملوں کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (Predicate) یکساں ہوں گے جیسے پیلا رنگ پیلا ہے، دائرہ گول ہے [Circle is round]، ۲۔ یہ جملے بذاتہ سچ (Self Evident) ہوں گے، ان کی سچائی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ۳۔ ان جملوں کا انکار تضاد کو جنم دے گا۔ ۴۔ ان جملوں سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

ب۔ synthetic proposition کے جملوں کی بھی چار خصوصیات ہیں: ۱۔ یہ جملے تجربے کے نتیجے میں ادا ہوتے ہیں لہٰذا فلسفے کی زبان میں [a posterie] ہوتے ہیں۔ان کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (predicate) یکساں نہیں ہوتے، مثلاً سیب سرخ ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر سیب سرخ ہو، ۲۔ یہ جملے بذاتہٖ سچ نہیں ہوتے ممکنہ سچ (probable truth) ہوسکتے ہیں کیونکہ یہ تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہر نیا تجربہ سابقہ نتیجے کا ممکنہ رد کرسکتا ہے لہٰذا ان جملوں میں تردید کا امکان موجود رہتا ہے۔ ۳۔ ان سے انکار تضاد کو جنم نہیں دیتا لہٰذا ان کا انکار برخود غلط (self contradictory) نہیں ہوتا۔ ۴۔ان جملوں سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان دلائل کے نتیجے میں عقلیت پرستی [ریشنل ازم] کی کم تری ثابت ہوئی اور تجربیت کی برتری ـــــ تجربے سے حاصل ہونے والا علم بہتر اور برتر ہے کیونکہ اس میں ہمہ وقت اضافہ، تغیر اور ارتقاء کا امکان ہے۔ کانٹ نے کہا تھا Analytical proposition کی خوبی یہ ہے کہ سچ کا حصول بغیر تجربے کے ہوتا ہے۔مگر یہ کمزور علم ہے اس سے علم میں اضافہ نہیں ہوتا ، مگر synthetic proposition علم میں مسلسل اضافہ کا سبب بنتے ہیں لہٰذا کانٹ نے ان دونوں علوم کو ملا کر ایک نئی اصلاح وضع کی جس میں ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوم سمو دیئے گئے ۔ اس نے اسے analytic synthetic judgement کا نام دیا۔ اسے وہ ایک مثال سے بیان کرتا ہے 2+5=7 یہ لازماً سچ ہے اس سے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کانٹ نے کہا تھا کہ ہر وہ بیان جو انسان کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ proposition نہیں ہوتا ، وہ فیصلہ Judgement ہوتا ہے اگر ہم proposition کو شامل رکھیں وہ موضوع subject کو نکال دیتا ہے۔ ایسا علم ماوراء انسان ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کی نفی کر کے ممکن ہوتا ہے لیکن کانٹ judgement کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فیصلے کے لیے subject کا وجود ضروری ہے۔ انسان کی نفی کر کے جو علم حاصل کیا جائے وہ علم نہیں ہے۔علم کا کوئی ایسا دائرہ علم نہیں کہلا سکتا جس میں انسان موجود نہ ہو۔ کانٹ کے اس فلسفے سے انسانیت پرستی (Humanism) کی عقلی بنیادیں بھی فراہم ہوئیں ۔عقلیت پرستی کے فلسفے کا انہدام ہیوم کے تجربیت کے فلسفے کے ذریعے ممکن ہوا۔کانٹ کی اس فکر نے جدید سائنسی علوم کو حقیقی، واقعی اور اصلی علم قرار دینے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ کانٹ کے فلسفیانہ استدلال نے یہ موقع فراہم کیا کہ علوم کے دائرے سے وہ تمام علوم خارج کر دئے جائیں جو تجربے، حواس اور تحلیل کے معیار پر پورے نہیں اترتے لہٰذا مابعد الطبیعیات کا علم بے وقعت ، لایعنی ٹھہرا اور حقیقی علم صرف سائنسی ، تجربی، حسی علم ہی

قرار پایا یہ وہ بنیادی تبدیلی ہے جس نے اٹھارھویں صدی کے بعد رفتہ رفتہ دینیات، الٰہیات اور مذہبیات کو علم کے دائرے سے مکمل طور پر خارج کر دیا۔ ہیوم اور کانٹ کی عقلی دلیلوں نے عقلیت کے فلسفے کی صدیوں سے مستحکم عقلی دلیلوں کا رد کیا اور اس کے نتیجے میں سائنسی علم کا فروغ ممکن ہوا ۔ (جاری ہے)

تزکیۂ نفس احمد جاوید

نماز اچھی کیسے ہو سکتی ہے؟

س: کوئی اگر ترک صلاۃ سے توبہ کر کے نماز کی عادت ڈالنا چاہے تو اسے کیا چیزیں تعلیم کی جائیں گی جن کی مدد سے اس معاملے میں استقامت بھی حاصل ہو جائے اور نماز کے ادائی کی بہتر سے بہتر صورت بھی پیدا ہوتی چلی جائے؟

ج: نماز کی دعوت ایمان کی دعوت کی طرح دینی چاہئے۔ یہ ایسا عمل ہے جو مستقلاً قلب و ذہن کو اپنے اثر میں رکھتا ہے یعنی نماز کے عمل میں نہ ہونے کی حالت میں بھی مسلمان نماز کے حضور اور کیفیت میں رہتا ہے۔ یہ نکتہ اگر سمجھ میں آ جائے تو ترک صلاۃ پر توبہ کے قیام اور دوام کی ایک مضبوط بنیاد خود بخود پڑ جاتی ہے۔ نماز کے سلسلے میں اپنے ماضی پر تائب ہونے والے کو نماز کی اہمیت اور مرکزیت کا استحضار رکھنے کی مشق کرنی چاہئے۔ یہ مشق اپنے طور پر اعلیٰ درجے کے ذکر کا فائدہ بھی دے گی۔ اس کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل امور دوام صلاۃ میں معاون ثابت ہوں گے:

۱۔ ترک معاصی

گناہوں کو چھوڑے بغیر تمام دینی اعمال کی طرح نماز بھی بے معنی اور بے روح ہو جاتی ہے لہٰذا اسلامی احکام کی ترتیب میں سب سے پہلا حکم ترک معصیت کا ہے۔ اس کی بنیاد پر ہی بندگی اور فرمان برداری کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ عبادت اور اطاعت کا ابتدائی تصور بھی ترک معصیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاہم زیر نظر مسئلے میں اس کی خاص افادیت یہ ہے کہ ترک صلاۃ پر کی جانے والی توبہ اس کے ذریعے سے مزید پختہ اور مکمل ہو جائے گی اور گناہ سے بچنے کے لئے جو فکر درکار ہوتی ہے وہ نماز کو بھی بھولنے نہیں دے گی۔

۲۔ تلاوت کا معمول

قرآن نماز کا مغز ہے اس کی تلاوت کو معمول بنائے بغیر نماز سے وہ نسبت حاصل نہیں ہوسکتی جو نماز کی مداومت اور تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس معمول کی ابتداء فجر کے بعد تلاوت کی عادت سے کرنی چاہئے۔

۴۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی تفصیلات کا علم

عقائد ہوں یا اخلاق و اعمال، ان سے ہماری وابستگی میں زندگی اور شدت اس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتی جب تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ محبت بن کر ہمارے سامنے نہ آ جائے۔ جس آدمی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کے احوال کا پتہ نہ ہو وہ نماز سے تعلق کا کوئی تقاضا بھی پورا نہیں کرسکتا۔

۵۔ نیک لوگوں کی صحبت

س: نماز کو بہتر کرنے کی تدابیر کیا ہیں؟

ج: سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بہتر نماز کہتے کسے ہیں؟ بہتری کا ایک قطعی پیمانہ بنا کر اس کی کوشش کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھی نماز کی ایک کلمے سے تعریف فرما دی ہے اور وہ ہے احسان۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو ورنہ اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔ اللہ کو نظر میں رکھنے اور اللہ کی نظر میں ہونے کا یقینی احساس نماز کی بہتری کا جوہر ہے۔ سب سے پہلے اس احساس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اصول احسان کی کوشش فرض ہے اس کوشش کے ضروری اجزاء یہ ہیں:

۱۔ قرآن سے تعلق میں مضبوطی، گہرائی اور ترقی پیدا کرنے کی مسلسل تگ و دو۔ بندے کو قرآن سے مناسبت ہو گی تو اس کی نماز اچھی اور معیاری بنے گی۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادات کا ضروری علم اور خصوصاً نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشتغال اور انہماک کی تفصیلات کا شعور اور اس کی روشنی میں اپنی نماز کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی کوشش۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت نماز کی اتباع کرے، اس کے بعد نماز کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رغبت کو اپنے اندر موجود رکھنے کی کوشش کرے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمول میں رہنے والے نوافل میں سے کم از کم کسی ایک کو اہتمام کے ساتھ اپنا معمول بنائے۔

۳۔ کثرت ذکر: دل کے حضور اور ذہن کی یکسوئی کے ساتھ زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا کثرت ذکر ہے۔ اصول احسان میں اس کا کردار بہت بنیادی نوعیت کا ہے۔

۴۔ مسجد آتے جاتے کسی نہ کسی ذکر میں خود کو مشغول رکھنا۔

۵۔نماز کے لئے شعوری طور پر اہتمام کرنا مثلاً وضو اچھی طرح کرنا، اذان و اقامت کا جواب دینا، ظاہری زینت اختیار کرنا، نماز شروع کرنے سے پہلے اور ختم کرنے کے بعد اس کی قبولیت کی دعا کرنا۔

۶۔نماز کو دعا کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ بہترین دعا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اس سے اللہ کا حضور پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات فضائل دعا میں آئیں گی وہاں دیکھ لی جائیں۔

س: احسان یعنی قلبی اور ذہنی یکسوئی کے علاوہ نماز کے ضروری محاسن کیا ہیں؟

ج: احسان نماز کیا پوری بندگی کی روح ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق باطن سے زیادہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ نماز کی بعض ظاہری خوبیوں کو احسان سے ممتاز کر کے بیان کیا جائے لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ نماز کی تمام خوبیاں احسان کے تابع اور اس سے براہ راست متعلق ہیں۔ ہم صرف سہولت کے لئے باطنی اور ظاہری خوبیوں میں تمیز کر رہے ہیں۔ بہر حال نماز کے ظاہری اوصاف کی ضروری فہرست یہ ہے:

۱۔ ہر نماز کی با جماعت ادائی

۲۔تعدیل ارکان یعنی نماز کے ہر رکن کو اچھی طرح ادا کرنا

۳۔نماز میں ساکت رہنا اور ہر طرح کی جسمانی حرکات سے پرہیز کرنا

۴۔تمام ارکان خصوصاً قیام کو طول دینا

۵۔نوافل خصوصاً تہجد میں محنت کرنا

۶۔نماز میں پڑھے جانے والے کلمات کا ترجمہ سیکھنا اور حالت نماز میں ذہن کو ان کلمات اور ان کے مفاہیم پر مرتکز رکھنا۔

س: نماز میں خشوع وخضوع بہت ضروری چیز ہے آپ نے اس کا ذکر نہیں کیا؟

ج: احسان اور نماز کی دیگر خوبیوں کا بیان دراصل اسی خضوع وخشوع کی تفصیل ہے۔ خشوع کا مطلب ہے نماز کی باطنی خوبی اور خضوع کا مطلب ہے نماز کے ظاہری محاسن۔ مختصر یہ کہ احسان اور تعدیل ارکان کی سعادت حاصل ہو جائے تو اسی کو خضوع وخشوع کہتے ہیں۔

س: بعض لوگ پنج وقتہ نمازی تو ہیں مگر مسجد جانے کا اہتمام نہیں کرتے اور اکثر نمازیں گھر ہی میں اکیلے پڑھ لیتے ہیں۔ اس خرابی سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

ج: سچی بات تو یہ ہے کہ کسی عذر کے بغیر مسجد کی جماعت کو ترک کرنا دراصل نماز کو چھوڑ دینا ہے ہم

ان ائمہ کرام کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں جن کی تحقیق کے مطابق جماعت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ جماعت واجب ہے اور اس واجب کو ترک کر کے نماز کی قبولیت کا گمان رکھنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ لوگ دراصل کچھ خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں مثلاً خود پسندی، کسل، اتباع سنت کے ذوق سے محرومی اور کم علمی۔۔۔ان خرابیوں کا علاج بھی ضروری ہے۔

س: ہم ایسے بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں جو اس کوتاہی میں مبتلا تو ہیں مگر نماز کی باجماعت ادائی کا کچھ نہ کچھ اشتیاق ضرور رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کی معاونت کے لئے آپ کیا تدابیر تجویز کریں گے؟

ج: اس طرح کے حضرات کی اکثریت عموماً کسل اور کمزور قوت ارادی کی مریض ہوتی ہے۔ان کے لئے بہترین تدبیر یہ ہے کہ کچھ دوست انہیں مسجد لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھالیں۔ جب نماز کا وقت ہو انہیں ان کی جگہ سے اٹھا کر مسجد لے آیا جائے اور نماز کے بعد واپس پہنچا دیا جائے۔ ان دونوں اوقات میں فضاء کو دوستانہ اور خوشگوار رکھنے کی کوشش کی جائے۔انہیں یہ تاثر نہ دیا جائے کہ ہم تمہاری کسی دینی خرابی کا علاج کر رہے ہیں۔ کچھ ہی مدت بعد ان شاء اللہ یہ اپنے اندر مسجد سے وہ مناسبت پیدا کرلیں گے جو نماز باجماعت کے لئے شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہئے کہ دیندار حضرات جب تک اپنے اندر حسن معاشرت نہیں پیدا کریں گے ایک دوسرے کے کام نہیں آسکیں گے۔

س: بعض لوگ نیک طینت ہوتے ہیں اور نماز کے ساتھ قلبی مناسبت بھی رکھتے ہیں مگر کوشش اور خواہش کے باوجود فجر کے وقت اٹھ نہیں پاتے اور ان کی یہ نماز عموماً قضا ہو جاتی ہے، ان لوگوں کے لئے آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟

ج: ہمارا موجودہ طرز زندگی بعض پہلوؤں سے دین کے مخالف رخ پر کھڑا ہوا ہے۔ یہ عذر اس طرز زندگی سے پیدا ہوا ہے۔فجر کے وقت اٹھنے کی اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہے کہ آدمی عشاء کے بعد فوراً سونے کی تیاری کرے۔

س: جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اکثر گھروں میں ایک شخص جلدی سونا بھی چاہے تو بھی اسے اس کا موقع نہیں ملتا۔اس صورت میں وہ بیچارا کیا کرے؟

ج: جی ہاں! اکثر گھروں کی صورت حال ایسی ہی ہے۔ اس صورت میں سب سے پہلے اسے دیگر اہل خانہ کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر یہ کوشش ناکام ہو جائے تو پھر الارم وغیرہ کے ذریعے

سے فجر کے وقت آنکھ کھلنے کی کوئی سبیل نکالنی چاہئے اور اگر خدانخواستہ یہ تدبیر بھی موثر نہ ثابت ہو تو پھر یہ شخص معزور ہے۔ امید ہے کہ اس معاملے میں قیامت کے دن پکڑا نہیں جائے گا۔ اس کی جماعت فوت ہونے کا وبال ان لوگوں پر آئے گا جو اس کا سبب بنے ہیں۔لیکن ایسے اصحاب پر لازم

ہم جس اصلاحی حکمت عملی کے موید ہیں اس کا عملی اظہار ہماری ان کوششوں سے ہوتا ہے جو ہم تحریک اصلاح تعلیم اور ملی مجلس شرعی کے عنوان سے کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ہم جو کچھ آج تک کر پائے ہیں وہ اگرچہ بہت تھوڑا ہے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں تاہم اس کے لئے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سراپا سپاس ہیں اور جو نہیں کر پائے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے ہم سراپا اضطراب اور مصروف جدوجہد ہیں اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق اور اس کی نصرت کے طلب گار ہیں۔ ہمارے ان کاموں کی ایک مختصر سی روداد حاضر خدمت ہے۔ امین

ہے کہ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے نماز ادا کرنے کی فکر کریں۔

ہماری سرگرمیاں: تعلیم و تربیت

تحریک اصلاح تعلیم (ٹرسٹ)

صحیح تعلیم وتربیت کی اہمیت

فرد اور معاشرے کی ہدایت اور بہتری کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں 'اصلاح' کی جو حکمت علمی طے کی ہے (ھود ۸۸:۱۱) اس کی اساس تعلیم و کتاب وحکمت اور تزکیہ کی وہ پالیسی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ سے سارے انبیاء کی پالیسی رہی ہے، اور خصوصاً پیغمبر اعظم و آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اللہ نے یہی اصول و لائحہ عمل دے کر بھیجا تھا کہ وہ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے ذریعے لوگوں کی اصلاح کریں تا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاریں اور آخرت میں اس کی رضا اور خوشنودی سے ہمکنار ہوں۔ 'تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ' کو آج کی اصطلاح میں ہم تعلیم وتربیت کہہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تعلیم قرآن حکیم (مع سنت رسولؐ جو قرآن حکیم ہی کی تشریح وتبیین ہے اور وہ معاون علوم جن کے بغیر خود قرآن وسنت کو نہیں سمجھا جا سکتا جیسے عربی زبان کی تعلیم و تدریس وغیرہ) ہمارے نظام تعلیم کا بنیادی جزو ہونی چاہئے اور دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے جن دیگر علوم وفنون کی ہمیں ضرورت ہو وہ

بھی قرآن وسنت پر مبنی اور ان کی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں اور ان کے خلاف نہیں ہونے چاہئیں۔ اور اس تعلیم کے ساتھ ساتھ اور اس کا نتیجہ ایسی تربیت و تزکیہ یعنی تعمیر سیرت و کردار ہونی چاہیئے جس سے فرد اللہ کا حقیقی 'عبد' بن جائے اور اپنی زندگی اپنے آقا و مولیٰ کے احکام کے مطابق گزار سکے تاکہ وہ دنیا و آخرت کی حسنات سمیٹ سکے۔

مذکورہ دو نکات پر مبنی لائحہ عمل جسے آج کل کی اصطلاح میں تعلیم و تربیت کہا جا سکتا ہے، دنیا اور آخرت میں کامیابی، ہر قسم کی انفرادی اصلاح، اجتماعی تبدیلی اور مسلم نشأۃ ثانیہ کی بنیاد ہے لیکن ہم نے بحیثیت مجموعی اس اہم حقیقت سے غفلت برتی ہے اور اس کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔

بگاڑ کی صورتیں

پاکستان میں تعلیم کم ہے، ثنویت پر مبنی ہے، غیر معیاری ہے، محض کاروبار بن چکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نظریاتی جہت سے عاری ہے اور مسلمان طلبہ کو ان کے بنیادی مقصدِ زندگی کے لئے تیار نہیں کرتی یعنی دنیوی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارنا تاکہ آخرت میں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔

تعلیمی ثنویت کا نقصان یہ ہے کہ تعلیم دینی مدارس اور جدید مغربی طرز کے اداروں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے جس کا نقصان یہ ہے کہ ہمارے ہاں مذہبی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے جو اس کے فضلاء کو موجودہ زمانے کی ضرورتوں، تقاضوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے اور جدید مسلم معاشرے کی رہنمائی کے قابل نہیں بناتی۔ دوسری طرف جدید اور عمومی تعلیم ہے جو بڑی حد تک مغربی طرزِ فکر و عمل کی نقالی پر مبنی ہے اور دینی تعلیم و تربیت سے تقریباً تہی دست ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے ہاں متوازن کردار کی حامل شخصیت پیدا ہی نہیں ہو رہی اور یہی وجہ بنیادی طور پر ہماری دین سے دوری، اخلاقی زبوں حالی، سیاسی عدم استحکام، معاشی زوال اور سماجی اقدار اور اداروں کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ہے۔

اصلاح کی حکمت عملی

اس صوت حال کی بہتری کے لئے تحریک اصلاح تعلیم کی حکمت عملی یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم و

تربیت مندرجہ ذیل منہاج پر مبنی ہونا چاہیئے:
۱۔ جدید تعلیم اسلامی تناظر میں اور مذہبی تعلیم کے ساتھ دی جائے۔
۲۔ مذہبی تعلیم میں عصری علوم اور جدید تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔
۳۔ مذکورہ دونوں تعلیمی دھاروں میں اسلامی تناظر میں تربیت کا اہتمام کیا جائے اور ان میں وحدت کی سعی کی جائے۔
۴۔ مغربی فکر وتہذیب کی اندھی نقالی سے بچا جائے۔

اصلاحی اقدامات

اس صورتِ حال کو بدلنے اور نظام تعلیم کی اصلاح کے لئے ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ۱۹۸۸ء میں ارقم فاؤنڈیشن قائم کی اور زیادہ تر انفرادی کوششوں کے ذریعے اس مقصد کے لئے کام کرتے رہے۔۲۰۰۱ء میں تحریکِ اصلاحِ تعلیم کوایک ٹرسٹ کے طور پر رجسٹرڈ کرایا گیا تا کہ اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لایا جاسکے۔

ٹرسٹ کے پیشِ نظر شروع ہی سے تعلیمی اصلاح کے کام کے دو پہلو تھے۔ایک موجودہ تعلیمی نظام اور اداروں کی اصلاح اور دوسرے موجودہ تعلیمی ثنویت کوختم کرتے ہوئے وحدت کی بنیاد پراور اسلامی تناظر میں ایک نئے رول ماڈل تعلیمی ادارے کا قیام جس میں سکول، اسلامک سنٹر، کالج اور ریسرچ سنٹر ہواور یہ سب مل کر بالآخر ایک جدید یونیورسٹی کی شکل اختیار کر جائیں جس کی زیادہ ترکیز سوشل سائنسز پر ہو اور جس میں جدید عمومی تعلیم اس طرح دی جائے کہ دینی تعلیم وتربیت اور کردار سازی اس کا موثر حصہ ہو۔اور دین کی خصوصی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ جدید مسلم معاشرے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو، عصری افکار کے چیلنجوں کا مقابل کر سکے اور معاشرے کو جدید تناظر میں رہنمائی مہیا کر سکے۔ اس ضمن میں آج تک ٹرسٹ نے انتہائی محدود افرادی قوت اور انتہائی قلیل مالی استعداد کے باوجود جو کام کئے ہیں ان کی تفصیلات انتہائی اختصار کے ساتھ درج ذیل ہیں ۔سہولت بیان کی خاطر ہم دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کی اصلاح کے لئے کیے گئے کاموں کو الگ الگ بیان کریں گے اور اسکے بعد رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کا ذکر ہوگا۔

جدید تعلیمی اداروں کے لئے اصلاحی اقدامات

۱۔نصاب سازی

۱۹۹۰ تا ۱۹۹۲ء ایک نیم حکومتی تعلیمی فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر پہلی سے بارہویں جماعت تک سارے مضامین کے لئے اسلامی تناظر اور جدید عصری تقاضوں کے مطابق نیا نصاب تشکیل دیا گیا جو ۲۵۰ صفحات کی ایک مطبوعہ رپورٹ کی صورت میں موجود ہے اور کئی تعلیمی ادارے اس رپورٹ سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔

۲۔نصابی کتب

مذکورہ بالا نصابی کام کو بنیاد بناتے ہوئے ٹرسٹ کے نائب صدر جناب پروفیسر ملک محمد حسین نے آفاق اور سحر سیریز کے نام سے بیسوں نصابی کتب مدون کیں جو اس وقت پاکستان بھر کے بہت سے سکولوں میں مروج ہیں صدر ٹرسٹ (ڈاکٹر محمد امین) کی مرتب کردہ بعض نصابی کتب بھی کئی اداروں میں زیر استعمال ہیں۔

۳۔اشاعت لٹریچر

اپنی اصلاحی تحریک کو عام کرنے کے لئے ٹرسٹ نے کافی لٹریچر تیار کیا ہے۔صدر ٹرسٹ کی تالیف کردہ کتب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل'، 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی'، 'پاکستان میں تعلیمی کی اسلامائزیشن'، 'اسلام اور تزکیہ نفس'، 'مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل'۔۔۔۔۔ملک کے علمی اور تعلیمی حلقوں میں معروف ومتداول ہیں۔علاوہ ازیں بعض بروشرز ہزاروں کی تعداد میں طبع کرا کے سکولوں میں مفت تقسیم کئے گئے جن میں سے چند ایک کے عنوانات یہ ہیں: ۱۔پرائیوٹ سکولوں کے نام۔ایک اہم پیغام ۲۔اسلامی تربیت۔کیوں اور کیسے؟ ۳۔انگلش میڈیم۔فائدے اور نقصانات ۴۔مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ۔

علاوہ ازیں تحریک کے صدر اور سیکریٹری علمی جرائد اور اخبارات میں اصلاح تعلیم کے حوالے سے مضامین ومقالات مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ٹرسٹ کے ایک رکن پروفیسر رب نواز صاحب مرحوم کی تعلیم کے فنی پہلوؤں پر اسلامی تناظر میں کئی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔

۴۔ٹیچرز ٹریننگ

ٹرسٹ کے زیر اہتمام تربیت اساتذہ کے پروگرام مسلسل جاری رہتے ہیں خصوصاً اس کے صدر اور سیکریٹری لاہور اور بیرون لاہور تربیت اساتذہ کے پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور اپنا اسلامی اور اصلاحی ایجنڈا اساتذہ کے سامنے رکھتے رہتے ہیں۔تحریک کے سیکرٹری جنرل وزارت تعلیم اسلام آباد اور لاہور کے سٹاف دوپلپمنٹ ڈائریکٹوریٹ کے ٹریننگ پروگراموں کے باقاعدہ ریسورس پرسنز میں سے ہیں۔

۵۔مشاورت و رہنمائی

ٹرسٹ کے منتظمین بہت سے تعلیمی اداروں کو بلا معاوضہ مشاورت و رہنمائی مہیا کرتے ہیں ۔مقصود اس سے یہ ہے کہ ادارے نہ صرف تعلیمی سہولتوں کے لحاظ سے ترقی کریں بلکہ اسلامی تناظر میں نصاب کی بہتری ،اساتذہ کی تربیت ،ہم نصابی سرگرمیوں اور طلبہ کی تربیت کے حوالے سے بھی ان کو مفید مشورے اور رہنمائی مہیا کی جاتی رہے ۔ٹرسٹ کے صدر وسیکرٹری جنرل کے علاوہ اس کام میں ٹرسٹ کی انتظامیہ کے ارکان جناب عزیز احمد مرزا صاحب اور پروفیسر سید وقار علی کاری صاحب کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ٹرسٹ کے سیکریٹری جنرل کی نگرانی میں لاہور کے ۳۰ سرکاری سکولوں میں طلبہ کی کردار سازی کا ایک مضبوط اور متنوع پروگرام زیرعمل ہے نیز ان سکولوں میں معیار تعلیم کی بہتری کے لئے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

۶۔میٹریل ڈویلپمنٹ

یونیورسٹی سطح کے نصابات کو اسلامی تناظر میں مدون کرنا اور اس کے مطابق تعلیمی مواد اور نصابی کتب تیار کرنا ایک بہت بڑا اور انتہائی اہم منصوبہ ہے ۔ٹرسٹ اس کام کو کرنا چاہتا ہے لیکن مالی وسائل کی کمی اس میں حارج ہے۔اس کے باوجود ٹرسٹ نے ۸۔۲۰۰۷ء میں لاہور کی مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسرز کو جمع کیا اور انہیں اس کام پر آمادہ و تیار کرنے کی کوشش کی ۔اس ضمن میں جامعہ پنجاب میں کئی سیشن ہوئے جس میں شرکاء کی خردافروزی اور تربیت کے لئے کئی لیکچرز ہوئے اور اسلامی علوم کے ماخذ تک رسائی اور عربی زبان کی تفہیم کے لئے ایک کورس کا انعقاد کیا گیا۔ٹرسٹ مستقبل میں اس کام کو زیادہ بہتر اور منظم انداز میں کرنے کا خواہاں ہے بشرطیکہ تحقیقی کام اور اس کی

اشاعت کیلئے ضروری مالی معاونت میسر ہو۔

۷۔ورکشاپس اور سیمینارز

ٹرسٹ اپنی اصلاحی فکر کو تعلیمی اور علمی حلقوں تک پہنچانے کے لئے مندرجہ بالا اقدامات کے علاوہ وقتاً فوقتاً ورکشاپس اور سیمینارز منعقد کرتا رہتا ہے۔اس سلسلے میں جامعہ پنجاب، ہمدرد سنٹر لاہور، اسلام آباد، فیصل آباد، سکھر اور کراچی میں کئی پروگرام منعقد کئے جا چکے ہیں۔ٹرسٹ کے منتظمین دیگر تعلیمی اداروں کے زیر اہتمام ہونے والی تعلیمی کانفرنسوں اور سیمینارز میں بھی شرکت کرکے اپنا اصلاحی ایجنڈا آگے بڑھانے کی تگ و دو کرتے رہتے ہیں۔

دینی مدارس کی تعلیم کے لئے اصلاحی اقدامات

ا۔اصلاحِ نصاب

ٹرسٹ نے ۲۰۰۰ء میں دینی مدارس کے نظام تعلیم خصوصاً نصاب کی اصلاح کے لئے ایک مہم شروع کی۔اس نے نصابی اصلاح کے لئے ایک ورکنگ پیپر تیار کیا اور اس پر حکومت سے منظور شدہ ملک کے چار وفاقوں یعنی امتحانی بورڈز (۱۔وفاق المدارس العربیہ [دیو بندی مسلک] ۲۔تنظیم المدارس [بریلوی مسلک] ۳۔وفاق المدارس السّلفیہ [اہلحدیث مسلک] اور رابطۃ المدارس [جماعت اسلامی]) کے سرکردہ علماء اور پنجاب کے بڑے دینی مدارس کے مہتمم حضرات سے ڈیڑھ سال کی مشاروت اور ڈائیلاگ کے بعد بالآخر ان سے تعلیمی و نصابی اصلاح کا ایک پیکیج منظور کروانے میں کامیاب ہو گیا۔اس اصلاحی پیکیج پر سارے مسالک کے علماء کرام کے تائیدی دستخط موجود ہیں اور یہ طبع شدہ ہے۔

اس اصلاحی پیکیج کی منظوری کے بعد اور اس کو بنیاد بناتے ہوئے ٹرسٹ نے دینی مدارس کے لئے آٹھ سالہ متبادل نصاب تیار کیا اور مدارس اور وفاقوں کو مہیا کیا۔بعض وفاقوں اور دینی مدارس نے ٹرسٹ کی بعض تجاویز پر جزواً عمل درآمد بھی کیا۔

۲۔تدریب المعلمین

ٹرسٹ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مدارس اگر چاہیں بھی تو وفاق کی وجہ سے نصاب تبدیل نہیں کر سکتے اور وفاقوں کے اندر نصاب کی تبدیلی بوجوہ انتہائی مشکل ہے، کام کرنے کا یہ راستہ نکالا کہ دینی

مدارس کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ ۲۰۰۳ء میں تدریب المعلمین کا چھ ماہ کا ایک کورس بیت الحکمت لائبریری لاہور اور جامع آسٹریلیا میں منعقد کیا گیا۔ اگلے سال نو ماہ کا ایک اقامتی کورس وفاقی کالونی کی ایک مسجد اور مدرسے میں رکھا گیا۔ ۲۰۰۶ء میں تدریب المعلمین کا ایک سہ ماہی اقامتی کورس محکمہ اوقاف پنجاب کے تعاون سے علماء اکیڈیمی میں منعقد کیا گیا اور چار ماہ کا ایک کورس ۲۰۰۸ء کے اوائل میں ٹرسٹ نے اپنے قائم کردہ ادارے صفا انسٹی ٹیوٹ میں منعقد کیا۔

ان کورسز کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سارے مسالک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں اور یوں مسلک پرستی سے بُعد پیدا ہوتا اور باہمی محبت و اخوت کو فروغ ملتا ہے۔ ان کورسز میں طریقہ ہائے تدریس کے علاوہ انگریزی زبان، عربی تقریر و تحریر، مغربی فکر و تہذیب اور عمرانی و سائنسی علوم کا تعارفی مطالعہ، تقابل ادیان، اسلام و عصری مسائل اور کمپیوٹر کی تدریس شامل ہوتی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ایک تربیتی کورس دینی مدارس کے مہتمم حضرات کے لئے بھی رکھا گیا جس میں مدارس کے ادارتی اور نصابی مسائل زیر بحث آئے۔ علاوہ ازیں بعض مدارس میں آن دی جاب ٹریننگ کا تجربہ بھی کیا گیا جن میں جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور اور جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ کامران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور شامل ہیں۔ یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ ان ٹریننگ کورسوں میں اساتذہ بھی مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جب کہ یونیورسٹی پروفیسرز بھی ان تربیتی سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں۔

۳۔ مشاورت و رہنمائی

ٹرسٹ بعض مدارس کو بلا معاوضہ مشاورت بھی مہیا کرتا ہے خصوصاً اعلیٰ تعلیم، دینی تربیت اور جدید علوم کی تدریس کے حوالے سے۔ اس ضمن میں معہد ام القریٰ جامعہ اشرفیہ لاہور اور جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ فیصل آباد کے لئے خصوصی رپورٹیں بھی تیار کی گئیں۔

۴۔ اشاعت لٹریچر

ٹرسٹ کے صدر چونکہ خود علوم اسلامیہ اور عربی کے پروفیسر ہیں اور معتدل دینی نظریات رکھتے ہیں لہذا انہیں دینی مدارس کے ساتھ ورکنگ ریلیشن شپ قائم کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ دینی مدارس کی تعلیم، نصابات اور دوسرے مسائل پر دینی جرائد اور اخبارات میں مضا

مین لکھتے رہتے ہیں ''ہمارا دینی نظام تعلیم'' کے نام سے ان کی کتاب بھی طبع شدہ ہے نیز "دینی مدارس کے نام ایک اہم پیغام" نامی پمفلٹ لکھ کر ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا اور مدارس کو بھیجا گیا۔

۵۔نصابی کتب

دینی مدارس کے لئے بعض نصابی کتب کی تیاری کا کام تدوینی مرحلے میں ہے۔فوری طور پر مغربی فکر وتہذیب اور مغرب کے عمرانی وسائنسی علوم کے تعارفی مطالعہ پر تین کتابیں طبع کرنا پیش نظر ہے کیونکہ اس موضوع پر اردو میں بہت کم مواد میسر ہے جس سے مدارس کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔

۶۔حکومتی ڈگریوں کا حصول

۲۰۰۸ء سے دینی مدارس کے فضلاء اور طلبہ کو ایف اے، بی اے، ایم اے اور ایم فل و پی ایچ ڈی کی تیاری کے پروگرام کا آغاز کر دیا گیا ہے تا کہ دینی مدارس کے طلبہ نہ صرف اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور انہیں اچھی ملازمت مل جائے بلکہ اس سے ان کا ذہنی افق بھی وسیع ہوتا ہے، ان کی مالی حالت بہتر ہوتی ہے اور وہ معاشرے میں اشاعت دین کا کام مزید مؤثر طریقے سے کر سکتے ہیں۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ تھا ان اصلاحی تعلیمی سرگرمیوں کا جو تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ پچھلے کئی برسوں سے ایک فرض سمجھ کر ادا کرتا آرہا ہے۔اگرچہ محدود وسائل کی وجہ سے یہ کام بڑے پیمانے پر نہیں ہوسکا اور معاشرے پر اس کے مفید اثرات نمایاں نظر نہیں آتے تاہم ہر صاحبِ نظر صاف دیکھ سکتا ہے کہ یہ درست سمت میں ایک مثبت کام ہے اور اگر یہ جاری رہا اور خصوصاً اللہ کی نصرت اور احباب کے تعاون سے زیادہ وسائل میسر آگئے اور اسے بڑے پیمانے پر کیا جاسکا تو اس کے تعمیری اثرات پاکستانی معاشرے پر ان شاء اللہ جلد واضح نظر آنے لگیں گے۔

رول ماڈل نئے تعلیمی ادارے کا قیام

سطور بالا میں مختصر تذکرہ تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کی ان سرگرمیوں کا کیا گیا جن کے پیش نظر نظام تعلیم کی اصلاح تھا۔اب ہم رول ماڈل تعلیمی ادارے کے قیام کے لئے ٹرسٹ کی کوششوں کا ذکر کرتے ہیں۔جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا کہ ٹرسٹ کے پیش نظر تعلیمی ثنویت کا خاتمہ ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ دینی تعلیم اور درس نظامی کے دیو بند ماڈل اور جدید مغرب پرستی پر مبنی علی گڑھ ماڈل کے بالمقابل ایک ایسا نیا رول ماڈل تعلیمی ادارہ سکول تا یونیوسٹی قائم کرے جو ثنویت کی بجائے وحدت کے

اصول پر کام کرے، جو مذکورہ بالا دونوں رول ماڈلز کی خامیوں سے پاک ہو اور دونوں کی خوبیوں کا حا مل ہو۔تاہم یہ کام چونکہ بہت زیادہ سرمائے کا متقاضی ہے اس لئے اس کام کا آغاز نہ کیا جا سکا۔اگرچہ اس کے لئے ٹرسٹ کے پاس راولپنڈی،اسلام آباد سے ایک گھنٹے کی مسافت پر سوہاوہ۔چکوال روڈ پر ایک ہزار کنال زمین کی آفر موجود ہے اور اس غرض سے ٹرسٹ کے منتظمین کئی اصحاب خیر اور لاہور اور کراچی کے چیمبرز آف کامرس سے گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن اس بھاری پتھر کو ابھی تک ہلایا نہیں جا سکا۔

صفا انسٹی ٹیوٹ اور صفاء اسلامک سنٹر کا قیام

اس اثناء میں ٹرسٹ نے اس کام کی ایک عاجزانہ ابتداء کے لئے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں ۲۰۰۸ء کے اوائل سے کرائے کی ایک بلڈنگ میں صفا انسٹی ٹیوٹ قائم کر لیا ہے۔اس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیمی ثنویت کے برے نقصانات سے بچنے کے لئے دینی تعلیم کے فضلاء وطلبہ کو انگریزی زبان اور جدید علوم کے تعارفی مطالعے پر مبنی کورسز کرائے جا رہے ہیں اور انہیں جدید تعلیم کی ڈگریوں کے لئے تیاری کروائی جاتی ہے۔اسی طرح سکولوں،کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے اصحاب کو دینی علوم کا مطالعہ کروایا جا رہا ہے تاکہ ان کی یہ کمی بھی پوری ہو جائے۔

علاوہ ازیں صفا انسٹی ٹیوٹ میں دینی مدارس اور جدید سکولوں ہر دو کے اساتذہ کی تربیت کے پروگرام بھی منعقد کئے جا رہے ہیں تاکہ تعلیمی اصلاح کا جو کام ٹرسٹ کے پیش نظر ہے وہ آگے بڑھ سکے اور اس کے نتیجے میں اسلام کے ایک متوازن تصور کے مطابق مسلم شخصیت کی نشوونما کو فروغ مل سکے۔

اس کے علاوہ صفا انسٹی ٹیوٹ میں عمرانی علوم میں ایک ریسرچ سنٹر قائم کیا جا رہا ہے تاکہ قریبی یونیورسٹیوں کے سوشل سائنسز (خصوصاً اسلامی علوم) کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کو تحقیق کے لئے نہ صرف موزوں موضوعات کے انتخاب میں مدد دی جا سکے بلکہ بعد میں دوران تحقیق بھی ان کو مشاورت اور رہنمائی مہیا کی جا سکے۔اس کے علاوہ صفا انسٹی ٹیوٹ میں یونیورسٹی سطح کے نصابات کی اسلاما ئزیشن اور اس کیلئے میٹریل ڈویلپمنٹ کے کام کو منظم کرنے پر غور وفکر بھی جاری ہے اور اصلاح تعلیم کے لئے دیگر سرگرمیوں کو منظم کرنے کے کئی منصوبے بھی پائپ لائن میں ہیں۔

حال ہی میں تقسیم کار کی خاطر ٹرسٹ کی تعلیمی سرگرمیوں کو دو اداروں میں بانٹ دیا گیا ہے دینی سرگرمیاں صفاء اسلامک سنٹر کے نام سے اور تعلیمی اصلاح کے دوسرے کام صفاء انسٹی ٹیوٹ کے نام

سے کیئے جا رہے ہیں۔

اہمیت

یہ ایک مختصر روداد تھی اب تک تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ کے دینی اور تعلیمی کاموں کی۔ ٹرسٹ کی شروع سے یہ خواہش وکوشش رہی ہے کہ جب تک ہمارے جدید تعلیمی نظام میں اسلامی اجزاء اور تربیت وکردار سازی کو مؤثر طور پر شامل نہیں کیا جاتا اور دینی مدارس کے موجودہ مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح کر کے اسے جدید تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھالا جاتا پاکستان کے عوام وخواص میں دین سے دوری بڑھتی جا ئے گی ،ان کے اخلاق میں زوال آتا رہے گا اور ہم مسلمان نہ صرف دنیا میں ذلیل وخوار ہوتے رہیں گے بلکہ آخرت میں بھی ناکامی ہمارا مقدر بنے گی، **العیاذ باللہ**۔ اس لئے ٹرسٹ اس امر پر یقین رکھتا ہے اور اسی وجہ سے اسے ایک دینی فریضہ سمجھ کر ادا کر رہا ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلام کے متوازن تصور تعلیم کے مطابق اور وحدت کے اصول پر از سر نو قائم ہو جائے تاکہ ایسے افراد تیار ہو سکیں جو باعمل مسلما ن ہوں اور ایسا معاشرہ تشکیل دیا جا سکے جو مستحکم ومضبوط ہو تاکہ امت مسلمہ اپنی گم گشتہ عظمت کو دوبارہ پا سکے۔ اس تناظر میں ٹرسٹ کے کام کی اہمیت کا اندازہ ہر صاحب فکر ونظر کر سکتا ہے۔

مالیات

ٹرسٹ کے اصلاح تعلیم کے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے دو بڑے چیلنج درپیش ہیں ،ایک مالی اور دوسرا افرادی۔ اگرچہ افرادی چیلنج بھی کم اہم نہیں تاہم ٹرسٹ کو پاکستانی یونیورسٹیوں کے بہترین اور متدین اساتذہ کی ایک ٹیم میسر ہے جسے بوقت ضرورت منظم کیا اور بڑھایا جا سکتا ہے لہذا کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی اور علمی چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹرسٹ کے پاس افرادی قوت موجود ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ مالیات کی فراہمی کا ہے۔ اکثر اصحاب خیر ''دینی تعلیم'' کا یہ تصور رکھتے ہیں کہ یہ مسجد و مدرسہ قرآن و ناظرہ وحفظ کا نام ہے اور اسلامی خطوط پر جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنا ایک کاروباری کام ہے لہذا ٹرسٹ کا نقطہ ءنظر انہیں سمجھ نہیں آتا اور وہ اس سے اتنے مطمئن نہیں ہو پاتے کہ وہ اس کا عملاً ساتھ دیں۔

ٹرسٹ کو حکومتی سرپرستی اور مدد حاصل نہیں ہے۔ کسی بیرونی این جی او سے بھی اسے فنڈز نہیں ملتے یہی وجہ ہے کہ ٹرسٹ مالی مشکلات کا شکار ہے۔ لہٰذا ہم ان سطور کے قارئین سے درخواست کر

تے ہیں کہ اگر وہ ٹرسٹ کے کام کو تعمیری، اسلامی اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں تو وہ دامے، درمے، سخنے اس کی مدد کریں تا کہ جس عظیم کام کا ٹرسٹ نے بیڑہ اٹھایا ہے وہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

ٹرسٹ کا کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 02011478219 سونیری بنک، مین برانچ لاہور میں ہے۔اس کے حسابات ہر سال آڈٹ ہوتے ہیں اور ہر کسی کو ان تک رسائی حاصل ہے۔

مجلس منتظمہ

ٹرسٹ کو جسٹس (ر) خلیل الرحمن صاحب (سابق جج سپریم کورٹ و ریکٹر اسلامی یونیورسٹی)، جسٹس (ر) ڈاکٹر منیر احمد مغل صاحب (لاہور ہائی کورٹ)، مجیب الرحمن شامی صاحب (چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان)، اوریا مقبول جان صاحب (سیکریٹری اطلاعات و ثقافت حکومتِ پنجاب)، ماہرین تعلیم میں سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب (سابق مرکزی وزیر مذہبی امور وصدر اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)، اور علماء کرام میں سے مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب، مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب، مولانا حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب اور مولانا عبدالمالک صاحب کی سر پرستی اور

حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عید کے دن حضرت معروف کرخیؒ کو کھجوریں چنتے ہوئے پایا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے اس لڑکے کو روتے ہوئے دیکھا، پوچھا کہ کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں یتیم ہوں۔آج سب لڑکوں نے نئے کپڑے پہنے ہیں اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ میں اس لیے کھجوریں چن رہا ہوں کہ ان کو فروخت کر کے اسے اخروٹ لے دوں تا کہ یہ ان سے کھیلے اور نہ روئے۔ حضرت سری سقطیؒ نے آپ سے عرض کیا کہ میں اس کام کو سرانجام دے لوں گا، آپ بے فکر رہیں۔ پھر میں اس لڑکے کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ اسے نئے کپڑے خرید کر پہنا دیے اور کچھ اخروٹ بھی کھیلنے کے لیے خرید دیے اور اس لڑکے کے پژمردہ دل کو خوش کر دیا۔ اس فعل سے میرے دل میں ایک نور پیدا ہو گیا اور میری حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ (مخزنِ اخلاق از علامہ رحمت اللہ سبحانی)

مشاورت کی سعادت حاصل ہے جبکہ ٹرسٹ کے تعلیمی پروگرام کو لے کر چلنے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (سابق سینئر ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جامعہ پنجاب اور حال چیئرمین شعبہ اسلامی فکر و تہذیب، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور) اپنے ساتھیوں کے ساتھ دن رات کوشاں ہیں۔

مدیر کے نام

محترم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ،

البرہان کے گزشتہ چند شماروں سے مغربی تہذیب کی تفہیم کے حوالے سے ایک زوردار بحث پڑھنے کو مل رہی ہے۔ اِن سطور کا مقصد اس بحث کے آغاز کے پس منظر سے البرہان کے قارئین کو آگاہ کرنا ہے۔ مغربی تہذیب کی تفہیم کے حوالے سے کراچی کے بنیاد پرست سکالر علامہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا ایک مخصوص اور جاندار مؤقف ہے لیکن لاہور کے علمی حلقوں میں اسی حوالے سے خاصی ناواقفیت پائی جاتی تھی۔ پنجاب کے دور دراز مقام اور نہایت غیر معروف قصبے جھوک نواز میں قائم ادارہ بلال اسلامک سنٹر نے اس مکتبہ فکر کی رائے کو پنجاب کے اہل علم تک پہنچانے کا عزم کیا۔ اس سلسلے میں آٹھ نو ماہ کے مسلسل رابطے کے بعد انصاری صاحب کے شاگردِ خاص سید خالد جامعی نے مذکورہ ادارے کے زیر اہتمام جھوک نواز میں مارچ ۲۰۱۱ء میں ایک سہ روزہ علمی مجلس میں مغربی تہذیب کے حوالے سے اپنی فکر بھرپور انداز میں پیش کی۔ اس مجلس میں لاہور، اسلام آباد، بہاولپور، ساہیوال، اٹک، پاک پتن، وہاڑی، بہاولنگر اور ملتان سے تشریف لانے والے وکلاء پروفیسرز، ڈاکٹرز، مختلف تنظیموں کے ذمہ داران، کاروباری شخصیات، یونیورسٹی کے طلبہ اور سجادہ نشین حضرات نے استفادہ کیا۔ بعد ازاں خالد جامعی صاحب کی قیادت میں دو رکنی وفد نے مئی میں بہاولپور، وہاڑی، ساہیوال، چیچہ وطنی اور اوکاڑہ میں علمی مجالس سے خطاب کیا جن میں یونیورسٹی اساتذہ، رسائل و جرائد کے مدیران، معروف مصنفین، ملکی سطح پر شہرت یافتہ فکری شخصیات، ماہرین قانون اور مذہبی و سیاسی

تنظیموں کے ذمہ داران نے شرکت کی۔ تیسرے مرحلے میں ملتان اور ساہیوال میں جون میں خالد جامعی صاحب کے چار لیکچر ہوئے اور انہوں نے دیوبندی اور بریلوی مکتبۂ فکر کے دو بڑے دینی مدارس کے اساتذہ، منتظمین اور طلبہ سے الگ الگ خطاب فرمایا۔ یہ شکر کا مقام ہے کہ بلال اسلامک سنٹر جیسے چھوٹے سے ادارے اور اس کے کم علم اور بے وسیلہ منتظمین کے ذریعے پنجاب میں ایک مفید بحث کا آغاز ہوا۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ چھوٹے لوگوں سے بڑے کام لے لیتا ہے۔ یہ ؎

بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے

محمد ممتاز قطب
جامعہ پنجاب، لاہور

۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء

برادرم حافظ عاکف سعید صاحب ☆

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

میں نے حال ہی میں ایک خط انجینئر مختار فاروقی صاحب کو لکھا ہے جس کی ایک کاپی آپ کی اطلاع کے لیے ارسالِ خدمت ہے۔

کئی دنوں سے مجھے یہ خیال آرہا تھا کہ آپ سے عرض کروں کہ آپ کی تنظیم کو تعلیم کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ افراد سازی اور ذہن سازی میں اس کا کردار انتہائی اہم ہے۔ اگر آپ اس موضوع پر سوچنے پر آمادہ ہوں تو تعلیم و تحقیق سے متعلق آپ کے احباب کے ساتھ ایک نشست مفید ہوسکتی ہے خصوصاً قرآن کالج جیسے پراجیکٹ کو محض ایک روایتی دینی مدرسہ بنادینا میرے نزدیک محتاج نظر ثانی ہے۔

میں اس سے پہلے جماعت اسلامی کے محترم امیر صاحب کا دروازہ بھی کھٹکھٹا چکا ہوں۔ اب آپ سے بھی عرض ہے کہ ہمارے ہاں کی اقامت دین کی تحریکوں کو ترکی، مصر، انڈونیشیا وغیرہ کی اسلامی تحریکوں کے تجربات سے استفادہ کرنا چاہیے جنہوں نے تعلیم اور خدمت خلق پر تزکیر کرکے میدان مارلیا ہے۔

اللہ کرے آپ بصحت و بعافیت ہوں۔

☆ امیر تنظیم اسلامی پاکستان، لاہور

مخلص،

(محمد امین)

۱۵ دسمبر ۲۰۱۱ء

برادرم انجینئر مختار فاروقی صاحب [1]

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کل آپ کے دفتر سے فون آیا کہ ہم 'البرہان' میں جس 'نئی طرز کی یونیورسٹی' کی بات کرتے ہیں اس پر اگر ہم ہم نے کچھ ہوم ورک کر رکھا ہو تو وہ آپ کو بھجوا دیا جائے کہ آپ بھی 'قرآن یونیورسٹی' قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے مجوزہ جدید اسلامی یونیورسٹی کے بارے میں جو قدرے تفصیلی تحریر لکھی ہے وہ میری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' میں موجود ہے اور یہ کتاب غالباً آپ کی لائبریری میں ہوگی وہاں دیکھ لیں (۲) اس ضمن میں جو دیگر مختصر تحریریں اور پمفلٹ وغیرہ ہم نے تیار کیے تھے وہ بھی ارسال خدمت کر دوں گا۔

اس حوالے سے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میں نے شروع میں اس مجوزہ یونیورسٹی

۱۔ مدیر ماہنامہ 'حکمت بالغہ' وقرآن اکیڈمی جھنگ و ناظم اعلیٰ تحریک خلافت، پاکستان۔

۲۔ دینی تعلیم کے حوالے سے میری کتاب 'ہمارا دینی نظام تعلیم' بھی شائد آپ کی نظر سے گزری ہو۔

۳۔ قرآن یونیورسٹی کے نام سے چارٹر بھی شائد نہ ملے اور اس صورت میں مجوزہ یونیورسٹی ایک دینی مدرسہ بن کر رہ جائے گی جیسے گوجرانوالہ کے بریلوی حضرات کی اسلامک مدینہ یونیورسٹی، دیوبندی حضرات کی شاہ ولی اللہ یونیورسٹی اور سیالکوٹ کے اہل حدیث حضرات کی بخاری یونیورسٹی بن چکی ہیں۔

کا نام 'قرآن یونیورسٹی' ہی تجویز کیا تھا۔ اسی طرح اسے قائم کرنے والے ادارے کا نام 'تحریک رجوع الی القرآن' رکھا تھا (اور ان ناموں سے چھپا ہوا لٹریچر ہماری پرانی فائلوں میں مل جائے گا) لیکن بعد میں خیال آیا کہ اس سے یہ پیغام جاتا ہے کہ شائد ہم کوئی مذہبی تعلیم کا ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں جب کہ ہم بنیادی طور پر ثنویت کے خاتمے اور وحدت تعلیم کے داعی ہیں اس لیے ہم نے 'تحریک رجوع الی القرآن' کو 'تحریک اصلاح تعلیم' سے بدل دیا اور مجوزہ یونیورسٹی کے نام کے ساتھ قرآن کا سابقہ ترک کر دیا کہ تعلیم تو ہر شخص کی ضرورت ہے اور اس کے لیے صرف دینی حلقوں کو مخاطب کرنا شائد موزوں اور کافی نہ ہو(۳) ویسے بھی یہ لادین حلقوں کو چونکانے (اور مخالفت پر اکسانے) والی بات ہے۔(۱)

بہرحال نام سے قطع نظر اصل اہمیت وژن اور کام کی ہے جس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عرض خدمت ہیں:

وژن: مجوزہ جدید اسلامی یونیورسٹی تین بنیادی اصولوں کے مطابق کام کرے گی:

۱۔ اسلام کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کرے

۲۔ مغربی فکر و تہذیب کا رد کرنا

۳۔ وحدت تعلیم کا تصور

طریق کار: کرنے کے بنیادی کام چار ہیں:

۱۔ جب کہ ہم ابھی محض سوچ رہے ہیں اور تعلیم میں کوئی ٹھوس اور بڑا کام کرنا ابھی دور کی بات ہے اور معاملہ محض تمناؤں اور ارادوں تک محدود ہے (شائد اسی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ کا 'قرآن کالج' بھی مرحوم ہو گیا اور مقبول نہ ہو سکا کہ اس طرح کے ناموں سے تعلیمی ادارے کی اپیل اور جاذبیت محدود ہو جاتی ہے اور عام آدمی اپنے بچے وہاں نہیں بھجواتا بلکہ صرف آپ کی تنظیم کے اور آپ کے مخصوص ذاتی نظریات اور تصور دین سے متفق لوگ ہی اپنے بچے بھجواتے ہیں اور اس سے تعلیمی ادارہ فروغ نہیں پاتا۔ جب کہ یونیورسٹی تو ایک بہت بڑا (کروڑوں اور اربوں کا) پراجیکٹ ہوتی ہے اور اسے کسی خاص شخص یا تنظیم کے نظریات اور دین کی کسی خاص تعبیر تک محدود کر کے اس کی ناکامی کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ ویسے بھی مناسب یہی ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی میں وہ ہزاروں طلبہ آئیں جو فی الوقت اسلامی ذہن نہیں رکھتے تا کہ جب وہ وہاں سے جائیں تو اسلامی ذہن رکھتے ہوں، بجائے اس کے کہ آپ پہلے سے (صرف ایک خاص) دینی نقطۂ نظر رکھنے والے طلبہ کو جمع کریں۔

۲۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں اختلاف رائے برداشت کرنے کا کلچر نہیں ہے اور ہر فرد/ جماعت دوسروں سے سو فیصد اتفاق رائے کی توقع رکھتی بلکہ اس پر اصرار کرتی ہے؛ اور اس کے بغیر مل کر کام کرنے کو ناممکن خیال کرتی ہے۔

۱۔ عمرانی علوم کو اسلامی تناظر میں از سرِ نو مدون کر کے پیش کرنا

۲۔ سائنسی علوم کی اسلامی اسلوب میں تدریس

۳۔ اسلامی علوم کی اس طرح تدریس و تحقیق کہ وہ جدید مسائل و مشکلات کو حل کرتا اور عصری چیلنجز سے نمٹتا نظر آئے

۴۔ طلبہ کی تربیت یعنی تعمیر سیرت و کردار اسلامی اصولوں کے مطابق

عملی چیلنج: دو ہیں:

۱۔ افرادی قوت: جستجو اور محنت سے اساتذہ کی بنیادی ٹیم میسر آسکتی ہے گو سو فیصد ہم خیالی نہ ہو(۲) باقی لوگ ساتھ ساتھ تیار کیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ مالیات: اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے اور اس کی فراہمی کارے دارد ہے۔

میری رائے یہ بھی ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی لاہور یا کسی بڑے شہر میں قائم ہونی چاہیے تا کہ اہل علم بھی میسر ہوں اور بڑی لائبریریاں بھی۔ ہمارے پاس 125 ایکڑ زمین اس غرض سے سوہاوہ چکوال روڈ پر موجود ہے وہ حاضر خدمت ہے لیکن بڑے شہروں سے دور دیہات کی فضا میں ایک 'شہر علم' بسانا ناممکن حد تک مشکل ہے اور اس کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے، اگرچہ اس کے بعض فوائد بھی

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت سالانہ 400روپے تاحیات 5000روپے خصوصی تعاون 10,000 روپے

نام.. پتہ..

فون نمبر..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-71 فیصل ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

ہیں۔

اسلامی یونیورسٹی کے حوالے سے یہ چند ضروری باتیں تھیں جو میں آپ کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔کبھی لاہور تشریف لائیں تو بالمشافہ ملاقات میں مزید تفصیلات گوش گزار کرسکوں گا۔

مخلص،

(محمد امین)

ڈاکٹر محمد امین کی بعض اہم تالیفات

اردو　　۱۔　ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل

۲۔　ہمارا دینی نظامِ تعلیم

۳۔ تعلیمی ادارے اور کردار سازی
۴۔ مسلم نشأۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل
۵۔ اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش
۶۔ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ)
۷۔ حقیقتِ تزکیۂ نفس
۸۔ ترکِ رذائل (اصلاح اعمال و اخلاق کا حصہ اول)
۹۔ اسلام اور پاکستان
۱۰۔ اسلامی انقلاب۔ مفہوم، تقاضے اور حکمت عملی
۱۱۔ عصر حاضر اور اسلام کا نظامِ قانون
۱۲۔ مقالاتِ امین (دو جلدیں)
۱۳۔ مطالعۂ قرآن و حدیث (برائے جماعت اول تا پنجم)

بروشرز

۱۴۔ پرائیویٹ سکولوں کے نام ایک اہم پیغام
۱۵۔ طلبہ کی اسلامی تربیت۔ کیوں اور کیسے؟
۱۶۔ انگلش میڈیم۔ فائدے اور نقصانات
۱۷۔ دینی مدارس کے نام۔ ایک اہم پیغام
۱۸۔ مسلمانوں کی ترقی کا واحد راستہ
۱۹۔ حقیقتِ تصوف

انگریزی

۲۰۔ Riyadh-us Saliheen (2 Vols)
۲۱۔ Noble Quran, Part 1
۲۲۔ Islamization of Laws in Pakistan

عربی

۲۳۔ السلطة التشريعية۔ دراسة مقارنة